

ذکر شبلی

یعنی
”حیات شبلی“ مصنفہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی
پرسیر حاصل مبل لاگ اور تحقیقاً نہ تبصرہ

از
مولوی محمد امین زبیری ماہر ہندی

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ
پہلی اشاعت ۱۹۴۶ء

مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ
قیمت فی جلد ۸۰

گزارش

اُردو زبان میں ایک اُردو سونچ عمری (حیات سبلی) پر اتنا طویل تبصرہ غالباً پہلی مرتبہ پیش ہو رہا ہے۔ مگر یہ طوالت ناگزیر تھی۔

مصنف حیات یعنی علامہ ڈاکٹر ناظم دارالمصنفین (قاضی القضاۃ و امیر جماعت احمدیہ بھوپال) مولانا سید لیحان ندوی نے واقعہ آفرینی، مسخ حقیقت، التباس حق و باطل کا وہ کمال دکھایا ہے کہ اسکی صلیت بے نقاب کرنے کیلئے ناقابل تردید ثبوت اور مستند حوالوں کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کا بغیر طویل اقتباسات کے پورا ہونا ناممکن نہ تھا۔

علامہ مددوح خود ہی دُنیا سے علم و ادب میں ایک بے بدست شخصیت و شہرت کے مالک ہیں اُس پر ستر اذیہ کہ اُن بیانات پر ایک دوسرے رفیع المرتبت نئی علم اور مشہور و ممتاز بزرگ نواب صدیار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خاں ٹنڈوالی سابق صدر الصدد و امور مذہبی دولت آصفیہ و سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کالفرنس کی توثیق ہے اگرچہ وہ ایک نئی بدعت ہے تاہم اس طرح ان بیانات کو مستند تر بنایا گیا ہے۔

باتحیص سید (رح) اور علی گڑھ تحریک کے متعلق بعض جگہ دو ایک فقرہ ہیں جی نہیں بلکہ ایک دو غلطوں میں ہی ایسا زہر بھر دیا ہے جسکو دفع کرنے کے لئے بہت کچھ اِلت اختیار کرنا پڑی۔
بہر حال یہ تبصرہ ایک قوی علمی خدمت ہے جو بغیر تحسین و خوف ملامت پیش کیا جاتا ہے۔

نیا زمند

محمد امین زبیری مارہروی

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۱	سیریک کی وفات		گزشتہ ، تعنون
	زندگی کا دوسرا دور		معدرت ، غلطنامہ
۱۲۳-۱۹۷		۳	دیباچہ تبصرہ
۱۲۳	مولانا شبلی اور زندہ		حیات شبلی کا دیباچہ اور سچ
۱۵۸	سلم پونیوٹی تحریک	۷	ایک نظر
۱۶۱	بہی اور دستہ الگ کاپی منظر		تبصرہ و تنقید کتاب
۱۷۶	سیاسیات شبلی	۲۱	پہلا دور زندگی (علیگہ کا تعلق)
۱۹۷	مولانا کے اخلاق و عادت	۲۱-۱۳۳	
۱۱۲	کچھ متفرق	۴۰	سفر قسطنطنیہ اور ترتیب سفر
۲۳۶-۲۲۰	ضمیمہ	۵۲	الفادق کی تصنیف و خلاصہ
۲۲۰	تذکرہ شبلی (مختصر حالات)		خطاب شمس العلماء اور تبریک و
	ایشیائی اور اسلامی	۶۱	تہنیت کے جلسے
۲۳۸	طرز حکومت (از سیریک)		مولانا سے انگریزوں کی سیاسی
۲۴۵	تعلیق	۶۶	بدگمانی
		۷۱	سیریک سے کشمکش اور اختلاف
		۱۲۸	کالج سے نصرت لینے کی تجویز

تعاون

بچوں کے ٹیچر سیٹھ (۶) کے حضور میں
ایک نذر عقیدت، اور علیگڑھ تحریک کی بہت،
اس لئے میں اس کو نذرِ زندانِ علیگڑھ کے
کے نام پر معنون کرتا ہوں۔

محمد امین زبیری مارہروی

معذرت

افسوس ہو کہ چند ناگزیر اسباب سے کتاب میں غیر معمولی طور پر کتابت کی غلطیاں
 رہ گئی ہیں، بعض سین بھی غلط لکھی گئی ہیں، ان غلطیوں میں اکثر معمولی اور ناقابل
 اعتنا ہیں اور بعض اہم ہیں، اس لئے غلط نامہ شامل کرنا ضروری تصور ہوا امید کہ
 ناظرین کرام اہم غلطیوں کی صحت فرمائیں گے۔

غلط نامہ

صفحہ	غلط	صفحہ	غلط	صفحہ	غلط
۵	۱	خانگی حادثہ	خانگی حالت حادثہ	۲۰	چند روز
۶	۱۳	تلیج	تلیج	۳۳	ترکوں
۸	۱	کلیم مظفر نگر	ایمان مظفر نگر	۳۵	عزیزی
۲۹	۱۹	مولانا	سرسید	۱۲	جیل کی ادب
۲۸	۲۰	رام کو	رام پور کو	۵۱	بیان قابل
۲۹	۱۲	سنہ	۱۹۶	۵۳	دو
۳۰	۱۳	سنہ	۱۹۰	۸	خود بینی
۳۳	۱۹	یار باست	باشان ریت	۵۴	۲۳۶
۳۴	۴	کردی	کردائی	۶	ازالہ لغت
۳۴	۱۲	برد	پیر و	۵۴	بیان تھا
۴۰	۳	۴۹	۲۹	۱۶	وجہ سے ان کی

صفحہ	غلط	صفحہ	صفحہ	غلط	صفحہ
نیود	ہنوز	۵	۱۰۸	سلف ہے	۳ ۵۸
متعلق	مطابق	۱۶	۱۲۱	کے بعد نواب	۸ ۶۱
یہی کیا اور	بھی اور	۳	۱۲۲	زین العابدین	۲۰
کہ جہاں	کہ یہاں	۴	۱۲۳	”	۸ ۶۲
شہ	رشد	۲	۱۲۵	مطلقیت	۲۱ ۶۲
طبقے میں	طبقے کے	۱۳	۱۲۹	موقع	۵ ۶۸
۱۸۹۸ء	۱۸۹۰ء	۳	۱۲۴	کلیات	۹ ۶۹
ظاہری سنگ بنیاد	سنگ بنیاد	۱	۱۲۵	جس میں	۱۸
کہاں تک	کہاں	۱	۱۳۰	۱۹۰۰ء	۱۷ ۷۰
کو ناظم ندوہ	کو ندوہ	۷	۱۲۱	داستان ہے	۲ ۷۱
مناب	جناب	۸	۱۳۳	شاہکار	۳
انہوں نے	اس نے	۱۰	۷	کا ہے غلط	۳ ۷۳
لوگوں کا	لوگوں پر	۱۳	۱۲۵	الاسعدی	۱۸ ۷۵
اشتعال	استعال	۱۰	۱۳۸	علمائے	۱ ۷۷
چھینے کا	چھینے میں	۱۲	۷	زمانے میں	۱۶ ۷۷
برافر دختہ	بدا فر دختہ	۱۲	۱۴۹	نہیں ہونا	۲۰ ۷۷
دسائس	دسائس	۷	۱۵۵	انحلاق	۲۱ ۷۹
جن ارکان	جن کے ارکان	۹	۱۵۶	ہزار دو ہزار	۱ ۹۰
در ویک	دریک	۲	۱۶۱	۱۷۹۶ء	۲ ۱۰۰

صفحہ	غلط	صفحہ	صفحہ	صفحہ	غلط	صفحہ	صفحہ
سرگراں	سرگرداں	۶	۱۹۳	دم از دانش	دم دانش	۸	۱۶۲
(۳۷)	()	۹	۲۰۴	ابتدای مرآت	ابتدای مرآت	۱۳-۱۲	۱۶۶
کامل بہرہ	کامل برد	۱۸	۲۰۹	بچینید	بچیدہ	۱۵	۱۶۹
حرام	حزم	۲۰	۲۱۶	راہش	راش	۱۶	"
مربیانہ	جربیانہ	۶	۲۲۵	بدولت	ہر وقت	۲۰	۱۷۱
مولانا اڈیٹر	مولانا نبھی	۱	۲۲۶	بنگری	نیگری	۹	۱۷۲
قوی ملی جذبات	قوی دلی جذبات	۲	۲۲۷	شعہ	شاعر	۲۱	۱۷۳
۱۸۹۳ء	۱۲۹۳ء	۵	۲۲۸	شہرلیف	تعریف	۲	۱۷۵
اعادہ شباب	ارادہ شباب	۱۳	۲۳۱	ار	از	۵	"
صنف	صفت	۱۵	"	تاریخی	تاریخیں	۵	۱۷۶
ٹخنہ	تختہ	۲	۱۳۲	۱۸۹۵ء	۱۸۸۵ء	۱۱	۱۷۸
مندمل	مندس	۵	"	سطور	سلور	۲۰	"
اٹھاتے رہے	اٹھاتے ہے	۶	"	ساما سراپہ	سارا	۱۹	۱۷۹
۱۹۰۸ء	۱۹۰۸ء	۱۰	"	تعلیم	تعلیم	۱۶	۱۸۱
۱۹۱۳ء	۱۹۱۳ء	۲۱	۲۳۳	تفسیر	اسرار	۱۷	۱۸۲
امداد حاصل کی	ارادہ کر چکے	۱۹	۲۳۴	سپاس	شناس	۲۰	۱۸۳
۱۹۰۵ء	۱۹۰۵ء	۲۱	"	طول و عرفین	طول و عرفین	۱۸	۱۸۷
۱۹۱۲ء	۱۹۱۲ء	۱۱	۲۳۶	سرگراں	سرگرداں	۲	۱۸۹
بند	تباہ	۵	۲۳۷				
احتساب	اجتناب	۶	"				
علی و قوی	علی و قون	۵	۲۳۸				

دیباچہ تبصرہ

ہندوستان کے علمی و تصنیفی اداروں میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ایک خاص امتیاز اور شہرت حاصل ہے، اس ادارے کے رفقا و واقعات کی تحقیق اور روایات کی تنقید میں مشہور و ممتاز ہیں اور اسی تنقید و تحقیق نے ان کی تصانیف اور تالیفات کو مقبول اور ایک معیار بنایا ہے۔

• حال میں اس ادارے نے اپنے بانی شمس العلماء مولانا محمد شبلی مرحوم و مدفوعہ سوانح حیات اور علمی و علمی کارنامے "حیاتِ شبلی" کے نام سے نو سو صفحوں میں شائع کیے ہیں جس کے مصنف ڈاکٹر مولوی سید سلیمان ندوی (ناظم دارالمصنفین) ہیں اور جو صاحب سوانح (مولانا شبلی) کی تعلیم و تربیت کے بہترین نمونہ اور ان کے بانی ہیں، اور بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک ربع صدی سے زیادہ درایت و تنقید کے ساتھ نسیرت النبی کی تالیف، انگلستان اور مصر و حجاز وغیرہ کے سفر، انگریزی وانی سے مغربی اسالیب تصنیف کی معلومات اور نئی نئی کتابوں کے مطالعے سے وہ نہ صرف معاصر علما میں بلکہ متقدمین کے مقابلے میں بھی امتیاز رکھتے ہیں اس لیے حیاتِ شبلی کو ان کی تالیفوں کا مرتب یا تماشا گاہ سمجھنا چاہیے۔

• اس تصنیف کی ایک اور خصوصیت بھی ہو چو شاید ہی کسی اور ایسی کتاب کے حاصل ہوئی ہو اور وہ مہتمم کے الفاظ میں یہ ہے :-

• "نسب زیادہ مجددی نواب صدر یا و جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن شروانی

کامنوں ہوں جنہوں نے مسودہ کے ان آٹھ مسودوں کو بڑی محنت سے صرف
بجرت پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدے کی بنا پر کچھ بڑھایا اور اس
طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقعیت کی مہر سے گویا توثیق کی،
فللہ الحمد“ (ص ۵ حیات پہلی)

بلاشبہ نواب مدد خ کا علمی و ادبی مرتبہ بہت بلند ہے اور وہ پہلے شخص ہیں
جنہوں نے چالیس سال قبل مشہور سوانح عمری ”حیات جاوید“ پر جو اب تک اردو میں
عظیم النظیر سوانح عمری تسلیم کی جاتی تو ایک ایسا نقادانہ تبصرہ کیا تھا جو ان کے مخالف علمی
میں سمجھا گیا، ایسے توفیق کی توثیق کے ساتھ ظاہر ہے کہ کتاب کس مہیا را کو جس پائے کی چوڑی
کتاب کی ابتدا ترتیب مواد اور معاونین کے ذکر سے ہوئی ہو مواد کا زیادہ
حصہ مولانا کے رکاوٹ سے حاصل کیا گیا ہو معاونین میں سے جو لوگوں نے مواد کم ہوتا یا بڑا کم
تبصرہ بھی ہے۔ اس کے بعد دیا چھ و مقدمہ جو دیا چھ میں مولانا کی زندگی کا عطر بھینچا گیا
ہر مقدمہ میں پورب اور لکھنؤ کے بعض علماء کے اور (بطور گزیر) اعظمی گڑھ اور اس
کے اطراف کے حالات ہیں۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوئی جو مولانا کی ولادت حسب نسب اور پیش
تسلیم اور ابتدائی مشاغل زندگی کا بیان ہے پھر ۲ سال کی عمر میں علی گڑھ سے تعلق
پیدا ہوتا ہے اور زندگی سولہ سولہ سال کے روز اوقات پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ پھر لاہور میں
۱۸۹۵ء میں جو ایم اے انجمن کے علمی و علمی کاموں اور قومی مشاغل تصنیف و تراویح
رؤم و شام و مصر کے سفر، شمس العلماء کے خطاب اندہ میں شمول و وظیفہ سید را باد و غیر
پر مشتمل ہے۔ دوسرا دور سرسید کی رحلت اور کالج سے قطع تعلق سے شروع ہوتا ہے
یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ اس دور میں درستی صحت، عقیدتانی، ملازمت و
حیدرآباد و اضل تصنیف، تحریک دعوہ کی رہنمائی، حیدرآباد سے انڈیا ریسرچ

در العلوم ندوہ اور اس کی ترقی کی جدوجہد خانگی حادثہ عجز ندیا، ایسی کانیام اندوین
 ولفا سے اختلاف، تعلیمی، اسٹرکچر، مطالبہ اصلاح، تعلیمی و مذہبی اور قومی خدمت
 و مصروفیات، تالیف سیرت النبی، تالیف دارالمستفین اور وفات وغیرہ کا ذکر ہو
 آخر میں آل و اولاد اور اخلاق و عادات کا حتمہ ہو۔

لیکن مصنف و مؤلف کے احترام اور ان کی علمی و ادبی عظمتوں کے باوجود بلاخوف
 تردید کہا جاسکتا ہو کہ اکثر واقعات کے بیان میں رنگ آمیزی و مبالغہ ہو کہیں واقعات
 مسخ کئے گئے ہیں اور کہیں چھپائے گئے ہیں اور پیدا کئے گئے ہیں بے سرپا دیات
 اور نظیات کی مثالیں بھی موجود ہیں رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی بنایا گیا ہے بعض
 اقتباسات میں پوری دیانت بھی نہیں برتی گئی طویل اور شائع شدہ نظموں اور واقعات
 کی تکرار سے حجم بھی بڑھ گیا ہے۔

اس کوشش میں کہ اپنے ہیرو کو ہم عصر شاہیر سے بلند دکھایا جائے نہ صرف
 مبالغہ ہو بلکہ اسلوب بیان میں تعنت بھی آگیا ہے۔ پہلے دوزخ زندگی میں کسی خاص نظر
 سے سرسید احمد خاں کی ایسی نقیصہ و تحقیر ذکر کیا جیسا کہ بی بی میں وہ ایک پست ترین
 شخصیت نظر آنے لگتی ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی ہی محدود مطاعن نہیں بلکہ بعض دیگر مشاہیر پر بھی... تو لینی ہے۔
 غالباً اپنے مسلمہ کمالات اور مشہور قابلیتوں کے زعم میں مصنف اور مؤلف کو خیال
 ہی نہیں رہا کہ اس طرح کی لائف ہیرو کی علمی و تحقیقی زندگی پر ایک طعنے رہے گی۔
 اس حقیقت کا انکار بھی ناموزوں نہ ہوگا کہ ہماری قوم میں ایک اقل تسلیل
 جماعت ایسی ہے جو اپنے سیاسی رجحانات یا ذاتی عقائد کے باعث سرسید اور علی گڑھ
 یونیورسٹی کی مختلف رایوں سے برائیاں کرتے رہنا اپنا وظیفہ زندگی سمجھتی ہے۔
 مؤلف حیات مولانا بشیر دانی نے اپنے مائے فخر ہرے حیات جاوید میں لکھا

تھا کہ ”اگر قوم کے یہ ذہن نشین نہ ہو کہ اس میں کچھ ایسی قلم ایسے بھی ہیں جو بخلاف معاذ کے قلم کے ظاہری امور کی تہ میں پہنچنے اور تاسر مادہ کے موقع پر نشترین کر اندر پیر جاتے ہیں اس وقت تک قوم سیدھی نہیں جا سکتی۔“

صاحب سوانح (مولانا شبلی) نے اس تبصرے کی داد دی تھی کہ ”اگر یو یو بھی ایسے لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہو۔“ (۶۱۰ حیاتِ شبلی)

اسی تبصرے حیاتِ جاوید میں موقوف حیاتِ شبلی کا یہ فقرہ طبع بھی ہو کہ ”لائف تاریخ کا جزو تاریخ کے کیا معنی ہیں واقعات کی حکایت اور جو کچھ واقعہ ہو اُس کا بیان آنے والی نسلیں اس کمی کو پورا نہیں کر سکتیں جو قائل نگاری میں معاصرین کے قلم سے رہ جائے بیشک آئندہ نسلوں کو ٹھنڈے دل سے بے لگا و فیصلہ کرنے کا موقع بمقابلہ معاصرین نہ ملے گا لیکن جن واقعات کو ہم عصر بیان نہ کریں ان کو وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں۔“

مگر یہ فقرہ اور اس کا مدعا نا تمام رہتا ہو اگر یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ ”اگر حکایت واقعات کسی خاص نظر سے مبالغہ و اخفا اور تحریف و طبع کے ساتھ کی جائے یا واقعات مفروضہ و تماشیدہ ہوں تو وہ ایسی گم راہی اور ضلالت ہے جس سے آئندہ نسلوں کا نجات پانا تقریباً ناممکن ہو اور وہ جو کچھ فیصلہ کرتی رہیں گی وہ ایک بدی گم راہی و ضلالت اور بناء القاسد علی الفاسد ہوگی۔“

راقم نے یہ طویل تبصرہ بھی انہیں اصول و نظریات کی بنا پر لکھا ہو اور محض حکایت واقعات تک محدود رکھا ہو۔

آخر میں اس بات کو ظاہر کرنا بھی بے موقع نہ ہو گا کہ یہ تبصرہ کسی نفرت و عداوت یا رشک و رقابت پر مبنی نہیں بلکہ محض درایت واقعات کے ساتھ ایک قومی فرض کا بجا آوری ہے اور اس نشی کے قلم کا ہر جس کو عرصہ ممتد سے صاحبِ سوانح اور

نوا رخ نگار کے ساتھ عقیدت و نیاز مندی کا تعلق ہو اور جو ہمیشہ ان کے مشن کا ہمراہ و حامی رہا ہو اور سیرت النبی (صلعم) اور سیرت عائشہؓ اور مکاتیب نبلی میں نمایاں ہو اور اس وقت تک دارالمصنفین کی رکنیت انتظامی کی نسبت رکھتا ہو۔

مفت نے دیباچہ حیات کے چالیس صفحات میں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ مولانا شبلی کے کارناموں کی اہمیت اور اُس پر ایک نظر

اقتیت بیان کی ہو مگر ان میں مبالغہ ہو، واقعات بے ربط ہیں دوسروں کی فضیلت تقدم اور ان کے کارناموں کو کہیں نظر انداز کیا گیا ہو اور کہیں ان کی حقارت ہو اس سلسلہ وار اس قسم کی چند مثالیں اور ان پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) انگریزوں کے برسرِ عروج آنے ہی تین طرف کے حملوں کا آغاز ہوا، مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئین پر حملے شروع کر دیے، دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پا کر ان پر تلے کی جراثیم پائی اور بس سے آخر میں یورپین علوم و فنون و تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی :-

اس کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانوی ڈاکٹر و ذریعہ خاں آگرہ مولانا رحم علی منگلوری مولانا محمد قاسم مولانا عنایت سول چریا کوٹی اور سید محمد علی کی خدمات کا (عیسائیوں کے مقابلے میں) اور آریوں کے دیانند سوسٹی کے مقابلے میں مولانا محمد قاسم کا ذکر کر کے آخری حصے کے مباحثین کی نسبت لکھتے ہیں کہ

”یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطریہ کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شہادت پیدا کئے اُن کا اصلی جواب تو وہ علما دیسکتے تھے جو ہمارے

کریم لکھنؤ کی طرح جو قدیم فلسفے میں ماہر تھے ۱۸۳۱ء کے نئے علوم اور نئی
تحتیقات سے واقف ہوتے مگر ہر حال میں سالہا سال وہ لفظ لایہ سرک کلمہ

اگر پورا نہ مل سکے تو ادھر وہی اسی کے اصول کے مطابق انہیں لوگوں میں
سے جو گو نیم عالم تھے لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے اور ان کے
علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے سرسید مولوی چراغ علی اور مولوی
کریم علی جو ننپوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کہتے ہوئے جنہوں نے اپنے

اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو پورا کرنا چاہا اور ان سے بہتوں کو ایک
معنی کرنا فائدہ بھی پہنچا لیکن چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق
کی صحبتوں سے مستفید تھے انہوں نے اپنے کاموں میں بگڑ بگڑ غلطیاں کیں اور
ایسی غلط تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقتاً بجا رطل و دھڑکتیں.....

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں
کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و
تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات
بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے اس دور میں
اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصے میں آئی وہ ہمارے ان اوراق

کا ہیرو ہے (۱۵-۱۶-۱۷) دیباچہ حیات

(۲) ”یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفے سے بہت کچھ ہٹ کر
تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی
جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی“.....

”ہندوستانی دانشمندان کا یہ سلسلہ ۱۵۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا
تھا۔ ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر آسٹریچر تھے

جو اس زمانے میں دہلی کلچ اور بنگال اینڈیا ملک سوانہی کے سربراہ کا رہی تھے
 ان کے بعد صوبہ یو۔ پی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے اور
 لوگ بھی اسی طرح آتے رہے ایسے ہوش مند حریفوں کے
 مقابلے کے لیے ساری دنیا نے اسلام میں جو شیروں اسلام کی صفحہ کے
 پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے انہیں کے طریقوں سے انہیں
 کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اس سلسلے کا آغاز
 مولانا نے اپنی گزشتہ تعلیم سے کیا (۲۵ دیا چھ)

”مخالفین اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند ہوا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم
 رعایا کو عام حقوق زندگی بھی حاصل نہیں اتفاق سے اسی زمانے میں آرمینیا
 کا واقعہ پیش آیا یعنی بڑکی نے آرمینیا کے عیسائیوں کی بغاوت کو جب
 بزدل ختم کر دیا تو یورپ کے اصحاب مسلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں پر
 مظالم کے ہودناک مرتبے کھاپے اور اس کا زائد دار اسلام کو قرار دیا اس
 موقع پر مولانا نے آرمینیا کے مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور
 ”حقوق الذمیین لکھ کر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو
 جو حقوق دیے ہیں وہ تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہیں بلکہ اس کی بلندی
 تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل کا پر پر وار بھی نہیں پہنچا ہے اس مضمون
 نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں (اور اس وقت کے برابر عیسائی اہل قلم
 اس کے جواب میں مصروف ہیں اور جس کے آخری کتاب اس کے جواب
 میں پروفیسر پادری اسے اپس ٹرمین سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی
 کا کتاب غیر مسلم رعایا مسلمان خلفاء کے ذمہ حکومت - سنہ ۱۹۱۹ء ہی)
 (صفحہ ۲۹ دیا چھ حیات)

(۳) ”تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرواز پورپنے قائم کیا ہو اور پورے مستشرقین جس وسعت نظر جو اور نادریکتاوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں نے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا جن کی طرح و ستائش کا اعتراف خود پورے مستشرقین نے علی الاعلان کیا اور اس طرح اسلام کی سر بلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے مولانا کے دست بازو نے اس کو علیٰ حالہ بلند رکھا اور اس کے لیے وہ ساری دنیا نے اسلام کے شکر پیے کے مستحق ہیں“

”عیسائی مدرسے کو شاں ہیں کہ وہ قرآن پاک کو محرف ثابت کر سکیں اور اس کے لیے وہ طرح طرح کی تدبیریں اور دسیہ کاری کیا کرتے ہیں جس سال انھوں نے وفات پائی ہو اسی سال اپریل ۱۹۷۱ء میں لندن سے ایک غلام بد مذہب کا گریجویٹ کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشے میں قرآن پاک کا ایک ایسا قلمی پڑانا نسخہ پایا ہو جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہو ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تہنیر کی چنانچہ ۲۵ اپریل ۱۹۷۱ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹیکل لکھا اور بڑے دعوے سے اس کا اعلان کیا اس اعلان کے مقابلے کے لیے بھی مولانا ہی کا مسلم میدان میں آیا اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا اور اس تحقیق کا راز تاریخ پود بکھیر دیا“ (صفحہ ۳۳ دیا چہ)

(۴) ”علمائے وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دل چسپی لی کانگریس کی حمایت کی ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے مسلم لیگ کے زاویہ نظر بدلنے کے لئے متعدد مضامین اور بیسیوں نظمیں لکھیں اور اسلام

کی رہنمائی کی اور ان کی بے راہ روی پر ان کو لوٹتے بھی رہے ہندوستان
 میں عالمگیر اتحاد کے وہ داعیِ اول تھے اوقاتِ اسلامی وقف علی الاولاد
 تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومتِ وقت کے سامنے
 پیش کر کے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر ان کا
 یہ بڑا احسان ہو، اس روشنی میں دیکھئے کہ اب آج کل جو حضرات علماء میں
 سیاسی سرگرمی ہو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہو ملکی
 مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہو اور ہندو مسلم اختلافات کو دور کرنے کے لیے
 جو دور بینی ہو اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہر حال سیاسی
 مسائل سے وابستگی ہو وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے۔ (۲۰ دیا چاہ)

ان چار مثالوں کو واقعات کی روشنی میں دیکھیے :-

(۱) معتقد بنے عیسائی مشنریوں اور آریوں کے حملوں کی مداخلت کے جواب میں
 جن بزرگوں کا نام لیا ہو بلاشبہ ان کی کوششیں قابلِ تائش ہیں اس سلسلے میں یہ واقعہ
 بھی قابلِ بیان ہو کہ بعض عربی داں اور قابلِ مسلمان بھی مشنریوں کے دام میں آ گئے تھے
 اور انھوں نے جو تصنیفات کیں ان کو مشن نے بہ کثرت شائع کیا۔ ان عریدین میں ایک **دوا**
 عماد الدین بھی تھے جنھوں نے ہدایت المسلمین اور تاریخ محمدی دو نہایت زہریلی کتابیں
 لکھی تھیں ان کے جواب کے لیے سب سے پہلے مولانا حالی میدان میں آئے اور پہلی کتاب کے
 رد میں ”ترتیبِ مسموم“ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور دوسری کی تردید میں ایک ”تبصرہ“
 بہ صورت رسالہ شائع کیا اور آلِ حضرتِ صلعم کے متعلق جو کچھ پادریوں نے لکھا تھا اس کا
 فلسفی اور غیر متعصب یورپین فضلا کی آرا سے مقابلہ کیا اس طرح انھوں نے ایک
 جدید اسلوبِ مباحثہ کی راہ نکالی اور یہ اولیت ان کے حصے میں آئی۔ اسی کتاب کا جواب
 بنوئی چراغ علی (نورِ عظیم یا رنگ) نے بھی لکھا جس کا نام ”تعلیقات“ ہو۔ اس

میں دکھایا ہے کہ مصنف نامہ شیخ فخری کے مافوق کفے غلط اور پوچھ ہیں ساتھ ہی احادیث کی صحت وغیرہ صحت پر بھی بحث ہے۔ یہ یوروپین فاضلوں کی رائیں بھی درج ہیں مسیح اور انجیل اربعہ پر بھی رد و قدر ہے اور تاریخی روشنی میں دکھایا ہے کہ مسیح کی سوانح عمری کس قدر غیر معتبر اور انجیلوں کی کیا وقعت ہے۔ یہ کتاب مکمل طور پر علم میں شائع ہوئی اس کے علاوہ انھوں نے اس زمانہ کے اخبارات منثور محمدی اور مخبر صادق میں اس قسم کے اکثر مضامین لکھے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا شبلی نانوی تعلیم کے مدارج طو کر رہے تھے۔

(۲) یورپ کی نئی نئی رائیں اور قوانین فطرت کے اسرار کے انکشاف نے جو شہادت پیدا کئے اس کے سلسلے میں مصنف نے سرسید اور مولوی چراغ علی کے کام کو ادھورا اور ان دونوں کو نیم عالم کہا ہے اور فوراً ہی بعد ایک اور دور یورپ کے مستشرقین کے جلو کا پیدا کر دیا ہے لیکن مہذبت کسی محو یہ میں ان ادوار کو آگے پیچھے کر گئے پہلا دور مشرقین کا ہی سائنس کا دور اس کے بعد آیا ہے بہر حال دور مشرقین میں ہی سرسید اور مولوی چراغ علی کا بڑا کام ہے جن کو نیم عالم بتایا گیا ہے لیکن مصنف جیسا کہ پہلی اس دور میں اسلام کی سعادت خدمت اپنے ہر وہ کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس موقع پر ہم سلسلہ دار تبصرو کرنے سے قبل یہ امر ضروری تصور کرتے ہیں کہ دیانت شبلی سے ہی مولانا شبلی کی کیفیت بیان کر دی جائے تاکہ ان کے علوم معقولات و منقولات کی تحصیل و درس کا اندازہ اور عالم و نیم عالم کے امتیاز کا بھی فیصلہ ہو سکے۔

مولانا نے مدعو عربیہ اعظم گڑھ میں عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں چند روز مدرسہ حنفیہ جو پور میں چڑھا "لیکن دراصل مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ مولانا فاروق چریا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔" (۲) مولانا کا بیان ہے کہ میں نے معقولات کی تمام کتابیں..... انھیں سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات انھیں کے افادات ہیں فارسی کا مذاق بھی انھیں کافیض ہے (۴) مولانا نے

حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقہ درس میں بیچہ کشفہ و اصول کی تعلیم حاصل کی
یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی (۸۰) وہ دیوبند گئے اور ایک مہینے کے قریب یہ
(۸۰) مولانا فیض الحسن سے درس ادبیات لیا (۸۲) مولانا کو سادہ عربی نگاری کا
شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا جو انھیں علی گڑھ آنے کے بعد ملیں (۸۳) مولانا
فیض الحسن سے مدت استفادہ کم رہی (۸۴) "مولانا نے دوسرے تمام علوم سے
فراغت پاکر مدینہ کی طرف توبہ فرمائی (۸۴)" مولانا احمد علی صاحب آستانہ علم
مولانا کی آخری درس گاہ تھی اس وقت سنن ترمذی کا درس ہو رہا تھا کہ مولانا کے والد
اور خاندان کے بعض احوال نے حج کا قصد کیا.... اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ برس کی
تھی اور کل مدت تحصیل چودہ برس ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سن ۱۲۱۲ھ سے تعلیم شروع اور
۱۲۱۹ھ میں تمام ہوئی بھٹی سے مایہوں کے اس مقدس قافلے کے ساتھ مولانا بھی
حجاز کو روانہ ہو گئے (۹۱) مصنف نے رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر کے مسنین
۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ لکھے ہیں اس طرح فقہ و حدیث اور ادب کی تعلیمی مدت ڈھائی
سال ہوئی جو حدیث کی بھی نا تمام تعلیم تھی تفسیر و عقائد کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں حج سے
واپسی کے بعد تکمیل نہیں کی بلکہ دیگر مشاغل اختیار کیئے غرض اس دو دوا میں علم کی کسی
شاخ کی بھی تکمیل نظر نہیں آتی یہاں الفاظ مولانا نو بھی نیم عالم ہی کہہ جا سکتے ہیں اور
یقیناً بھی ہے کہ ان کے معاصر علما مثلاً مولانا الطاف اللہ مولانا محمود الحسن مولانا
محمد ابراہیم کر دی مولانا اشرف علی تھانوی مفتی عبداللہ ٹوکی مولانا عبدالباری
فرنگی مٹلی مولانا شاہ سلیمان پہلوا ری (رحمۃ اللہ علیہم) کے پہلو پہ پہلو مولانا شبلی کو
کبھی جگہ نہ مل سکی، مگر جو خدمات کہ مولانا شبلی نے کیں اور اپنی نا تمام تعلیم کے
• باوجود پسینہ ذوق علی انہماک و ہمت اور ترقی کی بدولت ملک و قوم کو جو فوائد
بجھائے وہ تمام علمائے ستارہ کے مجموعی کاموں سے زیادہ ورنہ ہیں۔

مذہب کی رائیں بھی پیش کی ہیں جو ترکی سالانہ خاص واقفیت رکھتے تھے یا ان کو سفیر ہونے کی حیثیت سے ذاتی معلومات تھیں اور کتب بھی سلطان عبدالحمید خاں کے نام معنون کی سالانہ کہ وہ اس وقت ایک یاست میں ملازم تھے اور اعلیٰ خدمت پر مامور تھے اور شیخ خاندان کے رکن تھے۔ مولوی چراغ علی کی دوسری سفر کی تصنیف تحقیق الجہاد ہے یہ اس اعتراض کا جواب ہو کہ ”اسلام بڑا بشیر دنیا میں پھیلا یا گیا“ جو اس کے سلسلے میں ڈاکٹر اسپرنگر سرولیم میورا اور دیگر مصنفین کے ان بیانات پر جو اس مسئلے کے متعلق ہیں تنقید ہے۔

تیسری کتاب محمدی ٹروپرافٹ (محمد سچے رسول اللہ ہیں) ہو۔ اسی طرح اور متعدد کتب و رسائل ہیں جن کا سلسلہ ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۷ء تک (جس سال کہ مولوی چراغ علی کا انتقال ہوا) جاری رہا۔

مولوی سید امیر علی کی خدمات کا زمانہ بھی تقریباً انھیں سالوں سے شروع ہوتا ہو ان کی پہلی کتاب ”کریکل ان گزامینش آف دی لائف اینڈ ٹچنگس آف محمد“ ہو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک اور تعلیمات کو تحقیق کے ساتھ دکھایا ہو ”دوسری کتاب اسپرٹ آف اسلام“ ہو جو مشہور روزگار ہے تیسری ”اسلام“ ہو اور چوتھی ”لے شارٹ سٹری آف دی سلائیٹس“ ہو یہ سب انگلستان میں لکھیں اور شائع کیں اور مقبول ہوئیں اب غور کیجیے کہ یہ کابریہ سابقین الاولین ہیں یا مولانا شبلی اور اس دور میں دشمنان اسلام کی مداخلت کی سہادت ان بزرگوں کے حصے میں آئی یا مولانا شبلی کے آگیا ان مصنفین کی قدسائیت مستشرقین کا جواب ہیں یا مولانا کے چند مقالات مضامین جو کابریہ اور اردو داں طبقات تک نہ محدود رہے مصنف نے مولانا کے جواب دینے کا سلسلہ ”نرسہ تعلیم“ سے قائم کیا تو مگر اس کو لکھتے وقت اس طرف مولانا کا انتہائی سختی بھی نہ تھا، دانتہ انتہا بڑا مہر سید نے ۱۸۹۷ء کے اجلاس کانفرنس کے لیے

چند مضامین لکھوائے تھے ان میں تین مضمون مسلمانوں کی گزشتہ موجودہ اور آئندہ تعلیم پر تھے، مولانا نے گزشتہ تعلیم پر لکھنا پسند کیا وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”اٹھنا در میں شائع کیا گیا ہو کہ سبلی مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا شاید میں جی لگا کر لکھوں اور گراں مایہ لکھوں۔“ (مکاتیب جلد اول صفحہ ۸۲) چنانچہ یہ مضمون کانفرنس میں جسے سنایا گیا (روندۂ ۱۸۸۷ء) اور پھر بطور رسالہ کانفرنس نے شائع کیا، کوئی شک نہیں کہ دورِ اوّل میں مولانا نے نہایت اہم اور محققانہ مقالات لکھے ہیں ان میں متعدد ایسے ہیں کہ ان کے موضوعات پر کچھ مباحث موجود تھے جزیہ اور حقوق الملکین پر ۱۸۸۷ء میں مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب (اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام) میں بحوث کی ہر کتب خانہ اسکندریہ پر ایک انگریز نے یونانی و رومی تاریخوں سے استناد کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ کتب خانہ جو سیس سیزر کے وقت میں جلا تھا (خطوط ستریدہ صفحہ ۴۳) مولانا کا یہ شوق تصنیف علی گڑھ میں پیدا ہوا جہاں اس قسم کا بڑا مواد اور ستریدہ کا نادر کتب خانہ موجود تھا چنانچہ ایک خط میں لکھا تھا کہ ”سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دے دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں مگر صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھپو روپے کے صرف سے کرایا ہے میرے پھلانے میں ہے۔“ (مکاتیب جلد اول صفحہ ۷۷) ۱۸۸۷ء مولانا کے مذہبی مضامین میں حقوق الذمین سب سے اہم اور بڑا مضمون ہے جو علی گڑھ میگزین کی دو اشاعتوں اپریل و مئی ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا واقعہ یہ تھا کہ دو دھائی سال قبل آرمینیا کا جھگڑا بریاد ہو چکا تھا ترکوں پر الزام لگائے گئے تھے اور عیسائی دنیا میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف متعصبانہ جذبات بھڑکانے جا رہے تھے اور

پادریوں کا پردہ پگھلنا زور و شور سے جاری تھا اس سلسلے میں انگلستان کے متعصب پیشہ رپورٹرز نے ۲۰ جنوری ۱۸۹۹ء کے ٹائمز میں ایک آرٹیکل میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ مذہب اسلام عیسائیوں کے حق میں سخت ظالمانہ قانون ہے اس کا ترجمہ دتی کے مشنریوں نے ہنایٹا ہٹھام سے شائع کیا۔ مولانا کا یہ مضمون ڈیڑھ سال بعد اس ترجمہ مضمون کا جواب ہو جس کا عربی یا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا اور وہ رسائل تک محدود رہا، مصنف نے اس امر کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا کہ مسئلہ سے پہلے یعنی ۱۸۹۷ء میں کہاں کہاں کے عیسائی اہل قلم جواب میں مصروف رہے اور کون سا جواب لکھا گیا پادری اس لئے ٹرمین کی کتاب میں نہ کہیں شبلی کا نام نہ ان کے مضمون کا حوالہ نہ کوئی فہم لانا نشان ہو کہ وہ حقوق الذمین کے جواب میں لکھی گئی بلکہ یہ کتاب بڑے شام کی تنقید ہے اور اس ضمن میں یہ بحث بھی ہے۔ مستشرقین یورپ کی مدح و ستائش کے ادعا میں کوئی اقتباس حوالہ نہیں۔

سر سید اور سید امیر علی کے متعلق مولانا کا ایک بیان ملاحظہ کرنا چاہیے :-
 ”ایک عظیم الشان لٹریچر کی جو دوسری زبانوں میں پیدا ہو گیا ہو اسلام کو تباہ کرنے والا برباد کرنے والا کیا آپ کو اس طرح ٹھاٹھیں مارتے ہیں..... حضرت اس وقت تک جو کچھ اسلام کی خدمت کی جو غیر قوموں کے سامنے وہ ہمارے علمائے نہیں کی ہم نے نہیں کی جو مولویوں نے نہیں کی ہم دستار بندوں نے نہیں کی بلکہ ان لوگوں نے کی جو ڈاڑھی منڈاتے ہیں امیر علی نے کی ہے جو بالکل داڑھی منڈاتا ہو جس کو میں صورتاً عیسائی سمجھتا ہوں اس نے ایک کتاب اسپرٹ آف اسلام لکھی ہے اس کتاب کو پڑھ کر عیسائیوں اور یار علی نے اسلام کی وقعت اور تعریف کی۔“

اصل میں لفظ ”یہودیوں“ معلوم ہوتا ہے یہو کتابت سے ایمانیوں ہو گیا۔

سرسید احمد خاں نے خطبات احمدیہ جو انھوں نے انگلستان میں رہ کر لکھی ہو
 اس میں انھوں نے خاص خدمت انجام دی ہو اس کا اثر جو کچھ انگریزوں
 میں پھیلا دیا گیا اثر ہو آپ خود اس کو سمجھ سکتے ہیں، یہ کس قدر انوس کی بات
 ہو کہ وہ فرائض اور خدمات جو ہمارے ہیں ان کا ساغر ہم سے چھین کہ یہ
 زند قدح خوار پی لیں“ (۱۰۸ تا ۱۱۰ رپورٹ ندوۃ العلماء)

اب ڈاکٹر سنگھ نا کے قبا لے میں مولانا کی یکتائی و متعدد جوابی مضامین اور
 مار و پو و تحقیق کے تجزیے کی نسبت بھی واقعہ ملاحظہ کیا جائے۔

یہ مضمون ۲۵ اپریل ۱۹۱۱ء کو لندن میں شائع ہوا مہینہ دسمبر ۱۹۱۱ء بعد
 ہندوستان میں اس کی شہرت و اشاعت ہوئی اس پر مولانا نے ”یورپ اور قرآن
 کے عظیم الصحت ہونے کا دعویٰ ایک عنوان قرار دے کر مختصر مضمون لکھا جو مقالات
 جلی جلد اول کے صفحہ ۶۶ تا ۷۴ میں منقول ہو۔

مضمون کی تہید ہی میں مولانا نے لکھا ہو کہ ”مذکورہ صدر آرٹیکل پر ابھی کچھ لکھنا
 قبل از وقت ہو اس لیے کہ اس آرٹیکل میں ظاہر کیا گیا ہو کہ کیمبرج یونیورسٹی پر اس چند
 روز میں یہ مسودات شائع کر دئے گا اس لیے جب تک وہ مسودات شائع نہ ہو جائیں
 تفسیلی طور پر اس کے متعلق بحث نہیں ہو سکتی شائع ہونے کے بعد آسانی سے یہ فیصلہ
 ہو سکے گا کہ وہ مسودات کس زمانے کے ہیں اور ان کی صحت پر کہاں تک اعتبار کیا
 جاسکتا ہو اعتبار کے کیا وجوہ ہیں قدامت کی کیا کیا بنیادیں ہیں کس قسم کے اختلافات
 ہیں، ان مسودات پر عیسائیوں کا وسب تصرف کہاں تک پہنچا ہو۔“ (۶۶-۶۷ مقالات)

ان تحقیقات کو قائم کرنے کے بعد ایک مختصر بحث اس آرٹیکل پر ہو اور پھر اس
 بحث کے آخر میں لکھتے ہیں ”جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہو کہ اوراق مذکورہ کا ماخذ حضرت
 زید بن ثابتؓ کے زمانے سے پہلے کا ہو وہ اس کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کر سکتا ہو؟

کیا ان اوراق پر کتابت کی تاریخ لکھی ہو؟ کیا کاغذ کی کھنگی یا خط کی شان سے کتابت کا ٹھیک زمانہ متعین ہو سکتا ہو؟ کیا ڈاکٹر منگنا نیا اور کوئی صاحب ان اصول شہادت کے معیار سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے پر تیار ہیں؟ ان تمام امور کو معلوم کرنے کے لیے ہمیں اوراق مذکورہ کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے۔“ (۶۹-۷۰ مقالات)

اس کے بعد مولانا نے قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت اور تحریر و کتابت پر پانچ صفحات میں تاریخی روشنی ڈال کر اس فقرہ پر ختم کیا کہ ہم نے اس مضمون کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا، جب کیمبرج پریس اپنے کاغذات شائع کرے گا اس وقت ہم اس کو بتا دیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انہیں بن سکتا۔“ (۷۱ مقالہ)

کیا مولانا نے کاغذات شائع ہونے کے بعد کوئی اور مضمون لکھا جو درحقیقت مکمل جواب ہوتا مگر نومبر میں مولانا کا انتقال ہو گیا اور کاغذات بعد کو شائع ہوئے ڈاکٹر منگنا کے جواب میں سب سے زیادہ قابل قدر کام خواجہ کمال الدین (لاہور) ایڈیٹر اسلامک ریویو و امام مسجد دوکننگ (انگلستان) کا ہو جنہوں نے اس کے لیے مصر جا کر اتریں سالہ بھی جمع کیا اور تاریخی مواد کے ساتھ منظر پر لائے اس طرح منگنا کی تحقیق کا تار و پود بکھرا۔

بلاشبہ مولانا شبلی کی متعدد خدمات بہت قابل قدر ہیں خصوصاً وقف علی الاولاد تو بڑا ہی کارنامہ ہو مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مسٹر محمد علی جناح کی مساعی مشکور بھی شامل ہیں اور ان کا اعتراف مولانا مرحوم نے اپنی تحریر اور رپورٹ ۱۹۷۱ء میں کیا، ہو مگر مصنف حیات شبلی مسٹر مظہر الحق باریٹ لا کو یہ سارا حلقہ فیاضانہ طور پر عطا کر دیتے ہیں۔

مولانا مرحوم کا عالمانہ حیثیت سے سیاسیات میں حصہ لینا اور زمانہ حاضریہ میں علما کی سیاسی سرگرمیوں کا سہرا ان کے سر باندھنا مبالغہ بھی ہو اور خلاف واقعہ بھی۔

ان کو طبقہ علما میں کوئی عالمانہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی موقوف حیاتِ شبلی بھی ایک مؤرخ سے زیادہ نہیں مانتے کسی معاصر عالم نے ان کو مفسرِ فقہ یا محدثِ تسلیم نہیں کیا نہ کبھی ان کی قیادت مانی، ایک مضمون اور چند نظموں سے کوئی شخص سیاسی لیڈر نہیں بن سکتا۔

جنگِ عظیم کے تہمتے میں جب خلافت کو موضوعِ سیاست بنا یا گیا اور سیاست کو مذہبی رنگ آمیزی و امید کی ضرورت ہوئی تو پہلا لہجہ میں بااثر سیاسی اصحاب نے جن میں مسیح الملک حکیم محمد اہل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نہایت نمایاں تھے ان علما کو گوشوں اور حجروں سے باہر لاکر میدانِ سیاست میں کھڑا کر دیا یہاں ان کی شرکت کے نتائج سے بحث نہیں صرف یہ دکھانا ہو کہ مصنف حیاتِ شبلی نے مولانا کی ستارِ سیاست پر جو طرہ لگایا ہے وہ ان کا حق نہیں۔

متذکرہ صدر چند مثالوں سے مبالغہ و رنگ آمیزی اور صاحبِ سوانح کی عظمت کے لیے واقعات کی تخلیق اور دوسروں کی تعمیر کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے لیکن اب ہم متعدد حالات و واقعات کا جائزہ لیں گے جن کو مصنف سوانح نے تفصیل لکھا ہے اور جو ہمارے علم و مطالعہ اور تحقیق کے دائرے میں آتے ہیں۔

تبصرہ و تنقید کتاب پہلا دورِ زندگی

(۱) کتاب میں علی گڑھ کا سفر، سرسید سے ملاقات، ان کی مدح میں عربی قصیدہ، کالج کا تعلق، وغیرہ وغیرہ ان متعدد عنوانات سے مولانا کا پہلا دورِ زندگی

صفحہ ۱۸۱ پر آٹھویں باب - ۶

شروع ہونا، جو جب کہ ان کے والد شیخ حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ میں انہیں ہمراہ لے کر اپنے دوسرے فرزند ہمدی حسن سے ملنے کو آئے اس ہمید کو بیان گوئے کے مصنف جیسا کہتے ہیں کہ :-

منادی غیبیؑ آواز دی "آمد آں یارے کہ مای خواستیم" مولانا گئے
تو خالی ہاتھ نہیں گئے سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر
ساتھ گئے سرسید نے اس قصیدے کو دیکھا تو اس کے تہذیبی طرزِ ادا
کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور قصیدے کو اپنے علی گڑھ گزٹ (مورخہ
۱۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء) میں چھپوا دیا، (۱۱۸)..... قصیدہ میں سرسید کی
صرف دو باتوں کی تعریف ہو ایک اُن کے حسب و نسب و سیادت کی
اور دوسرے اُن کے قومی کاموں کی، ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی
قسم کا ماحانہ غلو اور پیشہ در شاعروں کی طرح گداگرانہ مذلت و ابتدال
نہیں اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی علف نفس اور ذہنی برتری کو ظاہر کرتی ہو (۱۲)

بلاشبہ قصیدے میں وہ باتیں ہیں جو مصنف نے بیان کی ہیں لیکن اس مدح
اور عربی نظم میں ایک مہم و ذہنی تھا۔ مولانا کے اوراقِ حیات سے معلوم ہوتا ہو کہ
اس وقت تک وکالت، ملازمت اور تجارت میں ناکام یا ناموزوں ثابت ہوئے
تھے اور ان کے والد چاہتے تھے اور ان کے خانگی حالات کا اقتضا بھی تھی کہ مولانا
حصولِ معاش کے ایسے مشغلے میں مصروف ہوں جو طبیعت کے مناسب بھی ہو علی گڑھ
میں ہی اس کا موقع تھا، اس زمانے میں علی گڑھ تحریک کے بانی و حامی سبکی وال
تھے اور عربی ادب کے ذوق رکھتے تھے چنانچہ ۱۸۵۷ء میں افتتاحِ مدرسۃ العلوم کے
وقت مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر میں مبارک باد لکھی تھی
۱۸۵۷ء میں سر ولیم میور کو ۱۸۵۷ء میں رئیسِ سفارت ترکی کو اور ۱۸۵۷ء میں مسٹر

بلنٹ سبر پارلیمنٹ کو عربی میں ایڈریس پیش کئے گئے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں اعیان منظر نگار نے خود سسٹرو کو عربی میں ایڈریس دیا تھا، مولانا شبلی نے بھی اپنی قابلیت کے اظہار کا ذریعہ عربی میں قصیدے ہی کو بنایا۔ اگر انہ ذلت و ابذال اور علو نفس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، سرسید کو انسانی جوہر پر کہنے کا ملکہ کامل تھا۔ انھوں نے ۲۴ سالہ نوجوان شاعر میں کچھ جوہر دیکھے اور اگرچہ بقول مصنف حیات، قصیدے میں بعض فن کی کمزوریاں تھیں (۱۲۰)، مگر نہایت حوصلہ افزا تمہید سے کالج کے اخبار میں شائع کیا گیا سرسید کو اپنی تعریف کی اشاعت مقصود نہ تھی بلکہ مولانا کو حلقہ علم و ادب میں دلچسپی بکھرانے کا تھا، پھر اس قصیدے کے سال سوا سال بعد ہی مولانا فیض الحسن کی سفارش پر ملتان چالیس روپیہ مالانہ پر اسسٹنٹ عربک پروفیسر مقرر ہو گئے۔ گویا اس قصیدے کا جملہ مل گیا۔

مصنف نے ان واقعات کے سلسلے میں مولانا شردانی موفق حیات کے مضمون ”سند رجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۰ جنوری ۱۹۱۹ء“ کا یہ اقتباس حاشیہ میں درج کیا ہے :-
 ”نوجوانی میں علی گڑھ تشریف لائے خان بہادر محمد کریم اس زمانے میں یہاں ٹی ٹی کلکٹر تھے ان کے قوتل سے مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم سسٹم ۱۸۸۵ء صاحب مدد کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا۔ کہتے آدھی ان کی جوہر شناسی کی بدولت کیا سے کیا ہو گئے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کلج کی پروفیسری کے لیے انتخاب کر کے سرسید احمد خاں کے سامنے پیش کیا۔“ (۱۲۲ حیات)

لیکن اس مضمون کا یہ اہم حصہ مصنف نے عمداً نظر انداز کیا

”یہ راستہ تھا مولانا شبلی کے ”علامہ شبلی“ بننے کا پھر سرسید کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلہ لے کر آ رہے سرسید مرحوم کو خداوند تعالیٰ نے ایسا دماغ

عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا ذوق علم اُن کے رگ و پل میں
ساری تھا اُن کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے مختلف مسائل پر جرح و قدح
ہوتی تھی جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔

مصنف نے گویا اس راستے کو قصداً اُبھلایا جس سے اعظم گڑھ کے مولوی شبلی ہندوستان
کے علامہ شبلی بنے، پھر مصنف نے ”سرسید سے میل جول کا عنوان قائم کر کے لکھا ہو کہ
”جیسے جیسے یہ ایک دوسرے سے ملتے گئے ایک دوسرے کی قدر پہچانتے
گئے مولانا کو سرسید کے کتب خانے کی محبت تھی اور سرسید کو ایک ایسے شخص
کی ضرورت تھی جو عقلی مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کو مدد دے سکے“ (۱۲۶)

اسی عنوان میں مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کے ایک مضمون کا اقتباس ہے کہ
”سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور نور خانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے
اور تحقیق و تدقیق کے لیے انھیں اکثر حدیث و فقہ اور تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعے
کی ضرورت پڑتی اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولوی شبلی نے
اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی
اور وسعتِ نظر تھی مولانا قائل ہوتے جاتے تھے اس سے زیادہ سید صاحب اُن کی
تلاش و جستجو اور جلبِ روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے..... سید صاحب
کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے اور مولانا
شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہو کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو ان دنوں شائع
ہوئی تھی ”صبحِ آمید“ ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب
کی برکت اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے
اور اسی زمانے میں علی گڑھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک
قومی نظم سنائی تھی“ (۱۲۷)

• مصنف کا مقصد تو یہ ہو کہ مولانا کو سرسید سے نہیں بلکہ اُن کے کتب خانے سے محبت تھی اور سرسید کو اپنی عقلی گرہ کشائیوں کی امداد میں مولانا کی امداد کی ضرورت تھی، کتب خانے کی محبت تو ہر اہل علم کو ہوتی ہو مگر عقلی گرہ کشائیوں کی امداد محض ایک ایجاد ہو کیوں کہ مولانا شبلی کی اس تک تو کیا سرسید کے بعد بھی عرصے تک اپنی ہی عقلی گرہ کشائیوں کی کوئی مثال نہیں اُن کی تصنیف و تالیف اور مقالات و مضامین کا دائرہ مورخانہ تحقیقات اور شاعری تک محدود رہا۔

مولانا تشر نے بھی جو کچھ لکھا ہو وہ بھی محل نظر ہے سرسید کے اعتقادی و کلامی اور مورخانہ تحقیق کا بڑا زمانہ وہ ہے جب کہ مولانا شبلی علی گڑھ میں آئے ہی نہ تھے ۱۸۸۲ء تک تفسیر القرآن کی چار جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور تہذیب الاخلاق جو سرسید کے ادبی و علمی مضامین کا جلوہ گاہ تھا ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۵ء تک بند رہا، پھر برسید کا جو دور ۱۸۸۲ء سے شروع ہوا اُن کی دوسری قسم کی مصروفیتوں کا تھا کالج کے کاروبار کی وسعت، فراہمی سرمایہ کی تدبیر اور اس غرض سے دوسرے والیسرے کی کونسل کی ممبری پبلک سروس کمیشن اور دوسرے اہم کمیشنوں میں شرکت ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس اُس کے اجلاسوں کا اہتمام روئدادوں کی ترتیب کانگریس کی مخالفت پیٹریارک اور ڈیفنس ایسوسی ایشنوں کے قیام اور اُن کے کام سب اسی دور (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۵ء) میں ہی مولانا تشر نے یہ بھی بڑا مبالغہ کیا ہو کہ ”سید صاحب کوئی کام بغیر اُن کے مشورہ کے نہ کرتے تھے“ کاموں کی نوعیت ہی بتا رہی ہو کہ کس قدر شاعرانہ مبالغہ ہو، پھر آخری پانچ برس میں (۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء) مولوی وحید الدین تسلیم پانی پتی لٹریچر ایسوسی ایشن کی حیثیت سے مولانا کے پاس رہتے تھے اور جن کاموں کی نسبت مولانا شبلی سے کی گئی ہو وہ اُن سے متعلق تھے۔

• مشنری سوسائٹی ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی اور بقول مصنف جس کو مولانا نے بعد کو

اپنی تصنیفات خارج کر دیا تھا (۱۳۹) اور طالب علمانہ تھپڑ کی نظم ۱۸۹۳ء میں لکھی تھی مگر مولانا نشر کرنے دو دنوں کا زمانہ ایک ہی کر دیا ہے،

مصنف حیات نے مولانا کی مستقل تصنیف ”الامون“ کا ذکر بڑے آب و تاب سے کیا ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی لیکن جدید اضافوں کے ساتھ دوسرے ادیشن پر سرسید کے دیباچے کا اشارہ بھی نہیں کیا اس سے قبل کتاب پر تقریفاً کا تو دستور تھا جو معاصرین لکھتے تھے لیکن سب سے پہلی کتاب ”الامون“ ہے جس پر ایک حلیل القدر ہم عصر نے دیباچہ لکھا اور جس سے کتاب میں چار چاند لگ گئے۔ مولانا شبلی کی یہ تاریخی تحقیق و تنقید اور مؤرخانہ رسائل و تصانیف دراصل سرسید ہی کا فیضِ محبت یا انہی کے ایک خواب کی تعبیر ہے انہوں نے جولائی ۱۸۶۹ء میں لندن سے مولوی سید مہدی علی خاں (محسن الملک) کو ایک خط میں لکھا تھا :-

”انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت نا انصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ ازراہ نا انصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ واقعی سمجھتے ہیں اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جو مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید اور ضروری ہے۔“

اس کے بعد فتح اندلس اور کردسید کی صحیح تاریخیں لکھے جانے کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف کی ایک تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں :-

”ایک عجیب بات سنئے کہ جو کتاب چھپ چکی ہے اس میں مصنف نے

لکھا ہو کہ جو الزام جلا دینے کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ لگایا جاتا ہو غلط ہے یونانی و رومی تاریخوں سے ثابت ہو کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے وقت میں جلا (بے وقوف شیخی پسند بعض ناواقف مسلمان مورخوں نے اس واقعہ کو جب مسلمانوں نے فتح مصر کی اس کے ساتھ لگا دیا) اس امر کا ایسا مستحکم ثبوت دیا ہو کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلا یا جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا (مجموعہ خطوط سرسید)

(۲) کالج پر مولانا کے اثرات، یہ ایک طویل الذیل عنوان ہو اور ایک ذیلی عنوان میں مصنف نے مولانا کی شاعری اور سرسار جنگاؤل کے مرثیہ کے متعلق لکھا ہے:-

”مولانا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی نام وری میں بہت کام آئی جتنے اکابر و احرار یہاں آئے ان کو درودِ طبع آشنا اور کالج کی ہمدردی اعانت کی طرف متغیت کرنے میں مولانا کی شاعری نہیں، ساحری بڑا کام دیتی تھی (۱۵۲) ذاتی طور پر ہمیشہ احرار کی مدح سرائی کو عارضہ سمجھا لیکن قومی کام کی ضرورت کی بنا پر وہ اس رنگ کو گوارا کر کے فرمائشوں کی تعمیل کرتے تھے مگر یہ بات ان کو دل سے پسند نہ تھی اس لیے یہ فرمائشی نظمیں ان کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پاسکیں (۱۵۳) یہ مرثیہ شاید اس لیے بھی کلیات میں جگہ نہ پا سکا کہ مولانا کے مخصوص انداز سے اس کا رنگ ہکا اور مزہ بھیکا ہو لیکن بہ حال مولانا سے اس کو نسبت ہو اور اس کا علی گڑھ سے دکن تک پورا اثر ہوا تھا اس لیے یادگار کے طور پر حاشیہ میں پورا مرثیہ نقل کر دیا جاتا ہو“ (۱۵۴)

اب ایک اور موقع پر لکھتے ہیں کہ

”خیر مقدم کے جلسوں کے پروگرام کا ضروری جزو مولانا کی نظم ہوتی تھی اس نعتی سے تمام معزز مہمانوں سے وہ نہ صرف روشناس ہو جاتے تھے

بلکہ ان کے فضل و کمال کا سکہ ان ہماؤں کے دلوں پر ثبت ہو جاتا تھا غلیفہ
محمد حسین وزیر پٹیلہ سر آسمان جاہ صدر اعظم حیدر آباد جنرل عظیم الدین خاں
دارالہام رام پور سے وہ اسی طور سے روشناس ہوئے تھے اور سب نے
ان کی قابلیت کا اعتراف کیا، (۸۱۲)

واقعات کی روداد صحیح ہے کہ کالج میں مولانا کی پہلی نظم مریخ سالار جنگنا ہو جو تقریر
کے پہلے پہنچنے میں لکھی سالار جنگ کا ساتھ رحلت ۸ فروری ۱۸۸۷ء کو ہوا مولانا
حالی نے ایک نظم فارسی لکھی جو ۲۰ فروری کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی
مولانا شبلی کے دل میں اسی کو دیکھ کر جذبہ پیدا ہوا اور ۲۷ فروری کی اشاعت میں
شائع ہونے کو دیدی، معترف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک خاص جلسہ مانتی ہوا اور اس
میں یہ نظم پڑھی گئی بلاشبہ اسی دن جلسہ ہوا جس میں منیجنگ کمیٹی کے مقامی ممبران شریک
ہوئے تقریر کے رد و لیونشن کے بعد شام تک کالج میں تعطیل ہو گئی لیکن روداد جلسہ
اس نظم سے خالی ہے یہ ضابطہ کی کارروائی تھی جو چند منٹ میں ختم ہو گئی علی گڑھ سے
دکن تک اس کے پورے کیا اور دوسرے اثر کا بھی شائبہ نہیں، دوسری نظم (مدحیہ)
غلیفہ محمد حسین وزیر پٹیلہ کی آمد ۱۸۸۶ء کے موقع پر ہے جو طعام شب کے بعد سنائی
گئی سید محمد دینے داد دی اور محاروج نے شکر یہ ادا کیا جس کا ذکر خود مولانا نے فخریہ
طور پر اپنے ایک خط میں کیا ہے اور حیات میں بھی صفحہ ۱۵۲ پر حوالہ ہے، اس طرح کی
مدح و ستائش کی بدعت مولانا شبلی نے ہی کالج میں شروع کی تاکہ وہ بھی ان امرا
میں روشناس ہو جائیں تیسری نظم ۱۸۸۷ء میں سر آسمان جاہ کی مدح میں ہو چوتھی
سر وقار الاحرا کی آمد پر (۱۸۸۷ء) تھی اس سلسلے میں جنرل عظیم الدین خاں وزیر
رام کو منسلک کرنا تم ظریفی ہے وہ کبھی کالج میں نہیں آئے نہ انھوں نے کالج کو
کوئی مدد دی نہ ان کی مدح میں مولانا کی کوئی نظم تھی البتہ ان کے حادثہ قتل پر ایک

مرثیہ ضرور ہو مولانا کی یہ شاعری یا یہ ساجری ان کی طبیعت کا مدعا نہ جذبہ تھا اہرا و اکابر کو درویش سے آشنا کرنا اور کالج کی ہمدردی و اعانت کی طرف متغیت کرنا محض مصنف کی خوش خیالی ہے خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیل بہت پہلے سے مرثیہ کے مفتی اور معاون تھے ان ہی کے اثر سے ہمارا جہ کی توجہ بھی مبذول ہوئی اور دسمبر ۱۸۸۵ء میں جلی گرامہ تشریف لائے اور گرانٹ مقرر کی نواب سر آسمان جاہ ۱۸۸۵ء سے زمرہ مصنفین کالج میں شامل تھے ان کے عہدے سے پرنسپل حال تعمیر ہوا جس کے عہد میں کتبہ پر بھی ۱۸۸۵ء نقش ہو نواب ممدوح نے جو کچھ ذاتی امدادیں کیں یا ریاست کے دہائیں وہ ان کے محمد (سکرٹری) مولوی مشتاق حسین دتار الملک کا اثر تھا، حیات جاوید و لذت کر و قار و نواب سر وقار الامرا کی مدح سے کچھ زیادہ بلند معنی گرد زلے حیدر آباد کی روایات کے برخلاف انھیں کے زمانے میں کالج کو کوئی مدد نہیں ملی صرف پانسو روپے کا وہ عام عطیہ ہو جس کا کتابہ اسٹریچی ہال میں نصب ہو جہاں اور بھی درجنوں ایسے معطیاں کے نام ہیں البتہ مولانا کو ذاتی فائدہ ضرور حاصل ہوئے مسہ میں ذلیفہ علمی مقرر ہوا اور مسہ میں نظامت شعبہ علوم و فنون ملی۔

مولانا شبلی نے ہر موقع پر ایسی نظمیں لکھی ہیں اور محض اپنی طبیعت کے تقاضے سے کہیں فرمائش کا ثبوت کیا شاید بھی نہیں (۱) قصیدہ تہنیت شادی سید محمود (۲) خیر مقدم مسٹر جوزف بک (۳) ترکیب بند بجا بجا سپاس نامہ اعیان دکن (۴) تہنیت سلامت ماندن شہزادہ دکن - اعلیٰ حضرت مسلم آصف صالح از حاضرات بندوق (۵) قصیدہ تشکر سرکار فردوس آشیان بھوپال (۶) نامہ تشکر بیگم صاحبزادہ (۷) مرثیہ نواب منیار الدین خاں نیر (۸) مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں پریسیڈنٹ کونسل رام پور (۹) قطعہ و داعیہ عطیہ بیگم فیضی (۱۰) غیر زباں داں دوست کے خط آمد و کی داد

بلکہ کلیات میں نام کی جگہ نقاط ہیں خطوط شبلی میں نام نمایاں ہو یہ غیر زباں داں دوست نہ بیگم فیضی ہیں۔

(۱۱) نظم متعلق یونی ورثی (جہ میں ہزار ہی نفس آغاخان کی بھی مدح ہو۔)

یہ بات بھی قابل لحاظ ہو کہ مولانا اپنے نظم لکھنے کے متعلق فرماتے ہیں ”میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر لکھنے کے بالکل قادر نہیں یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ ہاں اگر استیجاب سے فرمائشیں کیں اور کئی کئی دن تک طبیعت پر زور ڈالا لیکن کچھ نہ کر سکا۔“ (حصہ اول مسکاتیب صفحہ ۳۰۸) اس لیے مصنف جن نظموں کو تنگ عمار اور طبع غیور پر بار کہتے ہیں وہ یقیناً تاثرات ہیں اور کسی نہ کسی جذبہ پر مبنی خواہ وہ قومی خدمت کا ہو یا مذہب و شہرت کا، یا کسی اشتیاع کا، جیسا کہ سر و قیام الامرا کا قصیدہ، جس کے بعد مولانا تیسرا آواز گئے اور علمی وظیفہ مقرر ہو گیا،

یہ امر کہ بعض نظمیں کلیات میں جگہ نہ پاسکیں جامع کلیات کے ذوق کا نتیجہ ہو یا یہ کہ ان کو وہ دستیاب نہیں ہوئیں، ہم تو اسی نظم بھی کلیات اردو میں پاتے ہیں جس کی نسبت مصنف حیات کا دعویٰ ہو کہ مولانا نے اپنی تصانیف کا خارج کر دیا تھا اور پھر پھرت ہو کہ ”وہ وظیفہ جو کالج کے خیال سے بعض امرا کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں وہ چون کہ طبع غیور پر بار تھیں اس لیے ان کو بقائے دوام کا خلعت پہنانا چاہا (۲۲۵) (۳) تصنیفات کے ذریعے کالج کی اعانت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

”کالج کے زمانہ قیام تک انھوں نے اپنی تصانیف سے ایک جگہ فائدہ نہیں بٹھایا“ (۱۵۸) مگر یہ واقعہ بھی مبالغہ سے بیان کیا گیا ہو، مولانا نے اس زمانے ”۱۳۱۳ھ تا ۱۳۹۵ھ“ حسب ذیل تصانیف لکھیں :-

(۱) مشنوی صبح امتیاد (۳) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۳) الجزیرہ (۴) المسامون (۵) سیرۃ النعمان (۶) سفرنامہ ۱۰ ان میں سے پانچ کا حق تصانیف کالج کو دیا پہلی تین تو بہت مختصر (نظم و مقالات) تھیں مستقل تصانیف میں المامون کی دو اشاعتوں اور سیرۃ النعمان کی ایک اشاعت کا حق کالج کو دیا، ان کو کالج نے چھپوایا اور فروخت

کیا اور بہت ہی معمولی فائدہ ہوا اور ان کا یہ حساب برابر انٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتا رہتا تھا، سفر نامے کا حق مولانا نے محفوظ رکھا تھا اور اسی سے زیادہ فائدہ ہوا۔ صفحہ ۲۶۵ پر یونیورسٹی فارسی کورس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ”یہ کورس سالہا سال شاید ۱۹۶۶ء یا اس کے بعد بھی چلتا رہا مولانا جب تک کالج میں رہے سو سو یہ سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیتے رہے۔“ مگر یہ کورس آخری زمانے میں پروفیسر آرنلڈ اور مسٹر براؤن کے مشورے سے مرتب ہوا تھا اور اس میں پہلا امتحان ۱۹۶۶ء میں ہوا گویا ۱۸۹۶ء میں یونیورسٹی نے جاری کیا اور ۱۹۶۶ء میں مولانا نے کالج چھوڑ دیا، یہ سالہا سال کا زور کہاں سے آگیا۔ اس عطیے سے کالج کی رودادیں خالی ہیں۔

(۴) کالج کی شہرت میں مولانا کی تصانیف و مضامین و خطابات کا حصہ۔ ”اس زمانے میں بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسن ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولانا کی انہی تصانیف کا نتیجہ ہو اسی طرح حیدرآباد میں نواب عماد الملک سید حسین بگڑامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامے نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی یہی مولانا کی تصنیفات ہیں اس کا ذکر سرسید کے خطوط میں جو انہوں نے نواب عماد الملک کو لکھے ہیں“ (۱۵۸) ”نواب عماد الملک مولوی سید حسین بگڑامی سے مولانا کے تعلقات سرسید کے ذریعے ہوئے یہی سچ ہے کہ نواب صاحب ایک علم دوست آدمی تھے اس لیے سرسید نے نواب صاحب کے اسی راستے سے اپنی تحریک سے وابستہ کیا مولانا کی تصنیفات ان کے پاس بھی ہیں اور خود ان سے اس سلسلے میں ایک دو تصنیف کے طالب ہوئے غرض اس طرح مولانا کے نام اور کام سے نواب صاحب کو تعلق خاطر پیدا ہوا“ (۷۹۵)

سلفہ تقریر پر پروفیسر مارسیسن روئے داد کا غرض ۱۸۹۹ء۔

مگر واقعات اس ادعا کی تائید نہیں کرتے، ریاستوں سے عموماً جو امدادیں ملتی ہیں ان کے وسائل و ذرائع ہوتے ہیں سرسید کی زندگی میں جیسے جیسے یہ وسائل پیدا ہوتے گئے رام پور پٹیلہ اور حیدرآباد سے امدادیں ملیں، بھوپال میں اب تک کوئی ایسا وسیلہ نہ تھا اگرچہ علی گڑھ تحریک سے وہاں بیگانگی بھی نہ تھی۔ سب سے اوّلین تحریک یعنی سنٹیفک سوسائٹی کے کام پر نواب سکندر بیگم نے سال ۱۸۶۷ء میں ایک ہزار کی قیمت پر ایک گلو میٹ سرسید کو ہدیہ بھیجی جس کو انھوں نے فروخت کر کے زر قیمت سوسائٹی کے فنڈ میں داخل کر دیا (حیات جاوید حصہ اول و حیات سکندر زی) ۶۱۸۷۲ میں نواب شاہ جہاں بیگم والیہ ریاست نے انجمن خواستہ تعلیم مسلمانان کو عطیہ مرحمت کیا، (روداد سال ۱۸۶۸ء) اسی زمانے میں والیہ ریاست کا نواب صدیق حسن خاں سے عقد ہوا اور بھوپال پر متعینانہ مولویت چھا گئی اور اگرچہ پشرفائے بھوپال کے متعدد لڑکے کالج میں تعلیم پاتے تھے جن میں سے ایک حافظ ولایت اللہ کا ذکر حیات ثانی میں بھی ہے (گو نام غلط لکھا ہے) مگر یہ اتنے ذی اثر نہ تھے کہ دربار پر اثر ڈال سکتے، اس لیے ہندوہ سولہ برس تک امداد کا خیال ہی نہیں کیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں نواب صدیق حسن خاں جب ولایت وغیرہ کے الزام میں حکومت تاج کے معتبہ ہوئے تو صفائی میں سرسید کی بعض تحریروں سے جو ولایت کے متعلق تھیں استناد کیا گیا اور اب یہ نام کچھ احترام کے ساتھ سرکاری حلقے میں آنے لگا، نواب موصوفی کے فرزند اصغر نواب علی حسن خاں ایک روشن خیال عالم تھے علی گڑھ تحریک سے ان کو زور دل چسپی ہوئی، ادھر سرسید کے خاص دوست منشی امتیاز علی خاں وکیل لکھنؤ جو ۱۸۸۶ء میں صدر کانفرنس بھی تھے ۱۸۸۹ء میں وزارت پر فائز ہوئے اس طرح ایک سیلہ اور موقع پیدا ہو گیا وزیر کا والیہ ریاست پر خاص اثر تھا اور نواب صدیق حسن خاں کے معاملات میں انھوں نے بڑی کوشش کی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں سرسید نے حیدرآباد کا قصد کیا تو چوں کہ

محبوب ال بھی راہ میں تھا منشی امتیاز علی خاں وزیر ریاست کو قہر دلائی اور وزیر نے ہنس
 والیہ ریاست (شاہ جہاں سنگھ) کو متوجہ کیا، اس سفر کی روداد جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں
 شائع ہوئی تو اس میں بھی یہی درج ہو کہ وفد کے پھرنے اور بار بار یاب ہرنے کے تمام
 مراتب منشی امتیاز علی خاں نے طو کیے اور اس کے متعلق انہی کا شکریہ ادا کیا اور البتہ
 نواب علی حسن خاں اور دیگر اعیان ریاست نے جو فیاضانہ دل چاہی لی اس کا بھی تذکرہ ہے۔
 نواب، عاواں لکھنؤ کا، لوجہ کے۔ یہ پہلی کا سفر ازہ کا تھا۔ قراودینا اور ان کے
 نام اور کام۔ یہ نواب صاحب کا علاقہ خاطر پیدا ہونا مضحکہ خیز، اختراع و ترویج ہے۔
 صرف سید حسین بگڑائی پرنسپل کیننگ کا لے تھے علی گڑھ ٹرک۔ یہ ریاست ہندوستان
 تھے اور سینکڑوں سو سائٹی کے معاویہ ممبر تھے، مجموعہ خطوط مسٹر سید محمد، ایک خط لکھنؤ
 کا بھی تو جس سے دو فنی۔ کیے گہرے تعلقات کا اندازہ چھوڑنا، دلا بٹائی کا صرف
 وہ خطوں میں ذکر ہو ایک تو انہی کے سفر کے بارے میں ان کا بار الہ گزٹ ہے۔
 مسلمانان بھیجنے ہوئے اٹھا ہو کہ میں چہتا ہوں کہ نہایت مفید اور عمدہ چیز تیار ہو۔
 البتہ دوسرے خط میں جو ۲۰ مارچ ۱۸۸۵ء کا ہے اس سے بھی ذرا تعلقات کا۔
 میں مولانا شبلی کا بار بار امتحان دیکھتا ہوں جیسے کہ ایک نصف مرقی و بزرگ اپنے کسی فارسی
 جوان عزیز کو کئی قابل، قدر تھیں کہ سارے میں پیش کرتا ہو نیز اسی خط میں اس وقت کے
 متعلق کچھ ذکر ہو باقی خطوط مولانا کے ذکر سے خالی ہیں۔

سفر حیدر آباد ۱۸۸۵ء میں مولانا کی بھری کی نسبت بہت سی باتیں ہیں۔
 کہ اس سفر میں مولانا شبلی کی بھری، جیست سے خوب لگتا ہے کہ وہ دین سے اس قدر
 امتیاز یا ریاست سے نہیں لگتے تھے جو وہی نام و رسم سے کہ وہ سب سے
 منسلک ہوتے مگر واقعہ یہ ہے کہ حیدر آباد میں اس وقت کے گورنر جنرل نے
 مولانا کو اس وقت میں لکھا تھا کہ میں اس وقت کے گورنر جنرل ہوں۔

جو علم کے حقیقی کاروان اور شہدائے حق (۱۸۲)۔

اس کے بعد مولانا کی تصانیف کی قدر شناسی اور مرستیہ کے خط ۲۰ مارچ کا یہ اقتباس ہو کہ ”ان کو (مولوی شبلی صاحب) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہے میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں..... اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہو اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لاؤں گا تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں“ (۱۸۲)

اس وفد میں اراکین توڑ سنیاں کالج سید رضا حسین (پٹنہ) مولانا حالی (لاہور) اسماعیل خاں (دہلی علی گڑھ) مولوی سید زین العابدین، خان بہادر مولوی ذکار اللہ خاں تھے اور ہمراہیوں میں سید زین العابدین (خلف سید زین العابدین) سید احمد علی (سر سید کے نواسے) طلبائے کالج اور مولانا شبلی رکن اساتذہ اور مصطفیٰ خاں صاحب مصلحت دفتر انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھے، مولانا اپنی ہی خواہش اور شوق ملاقات سے گئے تھے اور سرسید ازراہ قدرافرمانی انہیں ساتھ لے گئے تھے، اس لیے کسی سرکاری امتیاز یا شان ریاست کی ضرورت ہی نہ تھی، اس سفر کے یادگار گروپ میں بھی مولانا انہیں ہمراہیوں کے ساتھ اراکین وفد کی کرسیوں کے پیچھے کی صف میں استادمہ ہیں ڈگریپ یونیورسٹی میگزین) اس موقع پر بشیر باغ میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں وقار الدار احمد تھے مولانا حالی اور مولانا شبلی نے انہیں بھی سنائی تھیں، مولانا شبلی کی نظم کے آخری دو شعر اس سفر کی شرکت اور برداشت مصافحہ کی وجہ پر شاعر ڈالے تھے۔

بعد ازیں جملہ دعا باکہ پذیراؤ خدا خویش راگریہ دلاؤ کہ ہم ہست بجائے
یعنی از نسبت آن شاہ گراچہ باشم نہ نظام است و بنید نظامی یا شتم

سرسید کے ساتھ وفد میں جو اصحاب شریک ہمراہ ہوتے تھے سب اپنے مصارف پر

خود برداشت کرتے تھے۔

(۵) کالج یونین سے مولانا کی دلچسپی کالج میں ایک یونین کلب تھا جو اب یونی وئی یونین کلب ہے جس میں طلباء تقریریں اور مباحثے کرتے ہیں اس زمانے میں اسٹاف کے ممبر اور سرسید وغیرہ بھی حنفیہ لیتے تھے جیسا شیخلی میں ان مباحثوں کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے اور صفحہ ۱۶۰ پر دو مباحثوں کا تذکرہ کیا ہے (۱) کیا ہمارا گزشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا (۲) جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا تختی، ظاہر ہے کہ یہ مباحثے طالب علمانہ ہوتے تھے اور اساتذہ اور دیگر اصحاب اس لیے شریک مباحثہ ہونے کے اسلوب تقریر اور طرز ادا اور اپنی معلومات کے طلباء کو مستفید کریں آخر میں موضوع بحث پر طلباء کی رائے لی جاتی اور کثرت و قلت آراء سے محرک و مخالف کی کامیابی معلوم کی جاتی۔ پہلا اصل موضوع جس کا اعلان ہوا تھا یہ تھا "ایشیائی طرز تعلیم انڈین یونی ورسٹیز کی طرز تعلیم سے زیادہ تر اپنے مقصد میں مفید اور کامیاب تھی" (جیسا شیخلی میں دوسرے لفظوں میں مختصر کر دیا گیا ہے) اس کے محرک مولانا شیخلی اور مخالف تھروڈ ایر کے ایک طالب علم "عبدالعلی" تھے مولانا اپنی تحریکیں کامیاب بناتے ہوئے۔ دوسرے موضوع کے متعلق (جس کا علی گڑھ میں کہیں پتہ نہیں اور نہ مجھ میں کالج ہسٹری میں جو فہرست مضامین درج ہے اس میں یہ موضوع ہے) مصنف لکھتے ہیں کہ "مولانا فرماتے تھے کہ جلسے میں سید صاحب بھی موجود تھے مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی دقت اور موثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی، یہ امر سید صاحب کے مذاقی سیاست کے سراسر خلاف تھا انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی بلکہ ایک مضمون بھی لکھا۔ تب جا کر ان کے دل کی بھر اس نکلی، سرسید نے اپنا یہ مضمون ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت کے عنوان سے ۲۸ جون ۱۸۹۱ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا (۱) اسی واقعہ مفروضہ کو دوسری جگہ (صفحہ ۲۹۴) پر دہرایا ہے "مولانا شیخلی مرحوم

شاید خلافت راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر فطرتاً جو ریاست پسند تھے، وہ اسلئے یہ
 شخصی حکومت کو پس کر رہے تھے حالانکہ دوسری طرف وہ اپنے آپ کو مذہباً مسلمان
 اور سلطاناً رب ہونے کی بنا پر ریویکل کہتے تھے آپ اور پڑھنا آپ کے پاس کوئی کلمہ نہیں
 کی ایک مجلس میں ایک دفعہ یہ چہرہ کی طرف سلطنت، کی تاکید کی اور اس پر خلافت اسے
 راشدین رضی اللہ عنہم کے واقعات، اور اصول انتخاب اسے استدلال کیا تھا یہ تحریر
 ہدایت کام یاب ہوئی اور طلبا مولانا کے زور بیان سے بہت متاثر ہوئے۔
 حاضرین میں سرسید مرحوم بھی تھے انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس پر طبیعت
 سیر نہیں ہوئی تو مولانا کے دلدار کے روم میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا اور اسٹی ٹوٹ
 گزٹ کے ۱۰ جون ۱۸۸۷ء کے پرچہ میں دنیا کی نئی اسلامی طرز حکومت کے عنوان
 سے مولانا کے سفر ترکی کے لیے روانہ ہو جانے کے بعد چھپا ہوا اس لیے ملاحظہ
 ہوتا کہ مولانا نے یہ تقریر اپریل ۱۸۸۷ء سے پہلے یا اس کے قریب زمانہ میں
 کی ہوگی۔

ان دونوں اجتماعات میں جو ایک ہی وقت کے متعلق ہوئے، ان کے نزاع
 بھی ٹھکانا رکھا جائے، بالخصوص اگر یونین میں یہ مباحثہ اسی شان سے ہوتا تو بھی کوئی
 اہمیت نہیں کہ جس کو اس طرح بیان ہے۔ ان کے متعلق تو بعض میں شواہد انعام
 بھی رہے ہیں ان کو بھی دکھایا جاتا مثلاً (۱) خطبہ دارالمذاہبہ پٹنہ، (۲) خطبہ دارالمذاہبہ
 (۱) مسلمانوں کی موجودہ حالت سے یقیناً جو انہوں نے ان کی آئینہ حاکمیت قرار دیا
 مانا، ہوگی۔ ان میں طلباء نے مولانا کو شکست دی کہ یہ اربعین ہوتا تو مولانا کی شبیہ طرح
 پہلے سب ختم کا ذکر پہنچتا (۲) صفحہ ۳۷ میں کہا ہے کہ وہ اس وقت سے مسیحیت
 کلمہ انہی اسی طرح اس سے زیادہ اہم لکھی، ذکر کرنے لگے کہ وہ ذکر نہیں کر سکتے تھے
 ضرور یہ موضوع تھا کہ "یہ جلسہ مثیل کانگریس کے انگریزوں کے ساتھ ہوا اور ان کے

بحث میں نہ سرسید نے حصہ لیا اور نہ مولانا نے،

اسلام سرسید کے مضمون کی طرف ناظرین کو متوجہ کرتے ہیں اس مضمون کی بنا و دیگر واقعات پر جو یہ تو مسلم ہو کہ سرسید کانگریس کے مخالف تھے دسمبر ۱۸۵۷ء میں بمقام الہ آباد کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا اور بڑے زور شور سے تیاریاں کیں۔ مسلمانوں کو انھیں طور پر شرکت کی ترغیب دی جا رہی تھی کانگریسی اصول کی اسد میں زیادہ سے حاصل کیے گئے اور دینیہ طریقہ اور خدا کے احکام سے ان کی نصیب کر دی گئی اور نعرۃ الابرار کے نام سے ان کا مجموعہ شائع کیا گیا (ان میں سرسید بھی خاص تھے) الہ آباد کے مشہور کشمیری وکیل پنڈت اجودھیا ناتھ نے بھی ایک مضمون شائع کیا تھا کہ ”چوں کہ مذہب اسلام کے پہلے چار خلیفہ موروثی قاعدہ کے علاوہ باقی دو سرے قاعدہ کے منتخب کئے گئے تھے اس لیے اس زمانے میں یہ پیر نہیں ہونے لگے۔ میر جو دھئی اور اس لحاظ سے تمام مسلمان جو شیخ کانگریس کی مخالفت کرتے ہیں یہ دیکھ کر ہر دہرا۔ کانگریس کے مصلحتی جو مباحث اخبارات میں شائع ہوئے تھے ان میں ہم کو دنیا بندگی کی غویں پر بھی کشیں ہوتی تھیں۔ کچھ بی مدت قبل مولانا کا لالہ محمد بن بونگھ ہاؤس نامہ پانچ گنگب بنیاد دیکھتے ہوئے جو تقریباً اسی میں مسلمانوں کو اپنی طرف سے متعلق کہہ رہا تھا۔ ان اسباب سے سرسید نے وہ مضمون لکھا اس نے ہم پر زور دیا کہ ہمیں حکومت کا مقابلہ نہیں ہو سکتا اس لیے اور اس لیے کہ ہمیں کے اور کوئی پیمانہ نہیں ساتھ مسلمانوں کو اپنی طرف سے توجہ دینا پڑی گئی اور دینا دینا زبردستی جو کانگریس کے مجبور معہ ایسے میں شامل نہیں ہوا اس لیے آخر میں بننے رہیں۔ درج ہوگا

مذہب نے مخالفت و تشدد کئے اصول پر مولانا کا جہہ ریت پسندی پر بھی انہیں اثر کیا اور دینا پانچ گنگب بنیاد دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو غرضاً غرضاً کی بنا پر

ریٹیکل ہونے پر طعن کیا، لیکن جس مضمون کی بنیاد پر طعن ہو اس کے آخری فقرہ کو نظر انداز کر دیا جو معنی ”وہ ریٹیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیئے جب زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو، نہ کہ اس حالت میں جب کہ زمانے کے حالات ان کے موافق نہ ہوں (حیات جاوید صفحہ ۴۴۴ طبع سوم)

(۶) محمد ن اینگلو اور نٹیل کالج میگزین کی ادارت (۱۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے محمد ن اینگلو اور نٹیل کالج میگزین کے نام سے ایک ضمنی سالہ نکلتا تھا جس میں کالج کے حالات مجلسوں کی رودادیں انجمنوں کی تقریریں اور اکابر کالج کے مضامین چھپتے تھے سلسلہ ۱۹۰۶ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا اس نئے انتظام میں مولانا مریوم نے اس کے اردو حصے کی اڈیٹری قبول فرمائی (۱۶۱)

(۲) ”سلسلہ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ میگزین کی اڈیٹری کی ذمہ داری جو مولانا کے سر ڈالی گئی اس سے مجبور ہو کر ہی مولانا کو اس زمانے میں متعدد مضامین لکھنے پڑے۔“
 مگر واقعہ یہ ہے کہ اس جدید انتظام میں جو خود اساتذہ نے کیا ہوا یہ ایک عورت تھی جو مولانا کو دی گئی انگریزی حصے کے اڈیٹر پرنسپل (مسٹر میکس) قرار دیے گئے دونوں حصے ایک ساتھ چھپتے تھے مولانا اگر منظور نہ کرتے تو کوئی مجبوری نہ تھی انھوں نے تو یہ خوشی اڈیٹری قبول فرمائی اور وعدہ کیا کہ ”میں اس رسالے کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا“ (۱۶۲) اور واقعی کوشش کی عمدہ مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے اور اسی تجربے سے رسالہ الہند وہ میں کام لیا اب سر ڈالی گئی ”اور مجبور ہو کر لکھنے پڑے“ کے الفاظ جو مصنف نے استعمال کیے وہ ان کے جذبہ منافرست کے ہی ترجمان ہو سکتے ہیں۔

(۷) کانفرنس کی خدمت ”عظیم ایجوکیشن کانفرنس کا نام پہلے سر سید نے ایجوکیشنل

کانگریس لگتا تھا چنانچہ ۱۸۸۵ء تک ۱۵۱ بکچریشنل کانگریس کبلائی تھی مگر جب انڈین نیشنل کانگریس نے شہرت پائی تو پرفیسر مارلین کے مشورہ سے کانگریس کے برے یہ کانفرنس بن گئی (۱۶۲)

”لیکن نام کی تبدیلی ۱۸۸۹ء کے اجلاس میں اس رزلویشن کے ذریعے ہوئی جس کے محرک منشی رضا حسین ایم۔ اے تھے) لفظ کانگریس شبہ میں ڈالتا ہے بعض سمجھتے ہیں کہ نیشنل نیشنل کانگریس کے ہو اور بعض اس کے برخلاف اینی کانگریس حالانکہ اس جلسہ کو دونوں باتوں سے تعلق نہیں اس لیے نام میں فرق کیا جائے اور محمد بن بکچریشنل کانفرنس قرار دیا جائے“ (مرقع کانفرنس)

۱۸۸۹ء میں کلکتہ کے اجلاس میں مولانا نے بی۔ اے میں فارسی قائم رکھے جانے کے متعلق ایک مدلل اور زوردار تقریر کی تھی، اس کے متعلق زبانی روایت کی بنا پر لکھتے ہیں ”اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سراوڈہرن بھی اجلاس میں موجود تھے انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ ”مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی کی طرح پُر اثر تقریر کر سکوں“ (۱۶۷)

اسی سلسلہ بیان میں مصنف نے مولانا کی تقریر کا خلاصہ بھی لکھا ہے اگرچہ حوالہ نہیں دیا لیکن اس کو کانفرنس کی ہی رپورٹ سے لیا ہو گی کیونکہ مولانا کبھی لکھی ہوئی تقریر نہیں کرتے تھے، رپورٹ میں کانفرنس کے رپورٹروں کا لکھا ہوا خلاصہ موجود ہے اور وہی مہنت کے پیش نظر تھا لیکن اس خلاصے کے بعد ہی لفٹنٹ گورنر کی تقریر کا ترجمہ بھی موجود ہے اس میں یہ فقرہ یا اس کے مرادف کوئی فقرہ نہیں البتہ انھوں نے سیلف ہیسلپ کے اصول و قواعد پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا کہ ”ہم اور آپ تمام لوگ واقف ہیں کہ جب تک سیلف ہیسلپ نہ ہوگی کوئی اصلی ترقی نہیں ہو سکتی اس کے بارے میں میں اپنے دوست مولوی شبلی شمس العلما کی مثال دوں گا (صفحہ ۴۷۱-۴۷۲)

جلسوں سے تعبیر کیا ہے ان جلسوں کی سوند ادبی نیابتِ شہلی میں درج کی گئی ہے نظم خیر مقدم اور مولانا کا ترکیب بند بھی منقول ہے لیکن مولانا کی تقریر شکر یہ تک کا ذکر نہیں جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ”پیارے بے کالج کی یاد بھر دو اور خشک دتریں ان کی رفیق و ہم دم تھی اور تمام اسلامی ممالک میں کالج کے نام کی عزت اور قدر کی جاتی تھی“ (انٹیلیٹ گزٹ فرمبرگ ۱۹۵۷ء) اسی طرح مولانا کو متنبہ مجیدی نے کا ذکر تو ہے لیکن فرمانِ اعلیٰ کی نقل نہیں حالانکہ مولانا نے اپنے سفر نامے میں اس کا چرم مع ترجمہ شائع کیا تھا، یعنی ”شہلی نعمانی آفندی جو دارالعلوم علی گڑھ واقع ہندستان کا معلمِ اول ہے چوں کہ شاہانہ تلفظ و کلمات کا مستحق خیال کیا گیا اس لیے اس کو متنبہ مجیدی درجہ چہارم کے عطا ہونے کے لیے حکم والا صادر ہوا اور اس کی سند کے لیے یہ فرمانِ عالی شان صادر ہوا ۱۲ / محرم ۱۳۱۱ھ“

اب یہ امر غور طلب ہے کہ مولانا جس فرمان کو اپنی عزت کی دشاویز سمجھ کر سفر نامہ میں شائع کرتے ہیں مصنف حیات اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس بات کو غلطی پر تو کسی طرح محمول نہیں کیا جاسکتا بجز اس کے کہ مصنف کو علی گڑھ کی اس نسبت کا اظہار گوارا نہیں جس سے یہ متغہ ملا۔

اس کے بعد تین صفحوں (۲۱۹ تا ۲۲۲) میں ترتیب سفر نامہ کا بیان ہے اور مصنف نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی قابلِ داد ہے، اول یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مولانا کا ارادہ قسطنطنیہ کے دفتر ان قیام میں ہی سفر نامہ لکھنے کا تھا، وہ اکثر سرسید کو متغہ خط لکھا کرتے تھے۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتے رہتے تھے ایک خط کے ساتھ وجہ اختصار پر سرسید کا یہ نوٹ بھی تھا کہ تفصیل سفر نامے میں ہوگی جو مولانا لکھتے ہیں گے مولانا نے ۲۵ مئی کو خورجی لکھا تھا کہ ”حالاتِ دوا چسپ ہیں اور سفر نامہ درجہ کے لیے بہت سامانِ مل جائے گا“ اب اس سلسلے میں مصنف حیات

نے پہلے مولانا کے ایک خط مورخہ ۲۴ اکتوبر کا حوالہ دیا، ہر سفر نامے کے لیے عام اصرار ہو اور تمام اطراف سے مانگ آتی شروع ہو گئی ہو لیکن میرا ارادہ اب تک کھینے کا نہیں، ہر جس کے متعدد اسباب ہیں اس کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ ”مولانا نے ان اسباب کی تشریح نہیں کی لیکن ان متعدد اسباب میں ایک سبب کا ذکر سفر نامے کے شروع میں کیا ہے۔“

”سفر نامے میں جس قسم کی اطلاعات لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت انتظام کا طریقہ عدالت کے اصول تجارت کی کیفیت عادات کے فیثیہ ان میں سے ایک چیز بھی اس سفر نامے میں نہیں البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتد بہ واقعات ہیں اگرچہ وہ اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں غرض جو شخص سفر نامے کو سفر نامے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہو وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہو ان کی دعوت میں یہ احضر پیش کیا جاسکتا ہو“ (۲۰۴)

مصنف نے سرف درمیانی فقرہ سے لیا جو حلال کہ تشریح کے لیے پورا بیان نقل کرنا چاہیئے، فقرہ محولہ و متذکرہ سے پہلا فقرہ یہ ہو کہ :-

”رمضان المبارک ۱۲۸۹ھ میں میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا وہ بعض ایک طالب علمانہ سفر تھا اور چوں کہ یہ نہ کوئی غیر معمولی امر تھا نہ واقعات سفر میں چنداں ندرت تھی سفر نامہ لکھنے کا میرا بالکل ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب سفر نامے کے متقاضی تھے میں نے خیال کیا کہ چوں کہ ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہو اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح

حالات سے بالکل اطلاع حاصل نہیں ہوئی لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بے جا نہیں سمجھ کر خود اپنی حالت یاد آئی کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا، یہ اسباب تھے جنہوں نے مجھ کو ان اوراق پریشاں کی ترتیب پر آمادہ کیا ورنہ ایسے عاجلاً اور معمولی سفر کے حالات قلم بند کرنے اور ان کو سفر نامہ یا کتاب السجلات کا لقب دینا تنگ ظرفی سے خالی نہ تھا۔

”میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہو اور اس قسم کی بحث میرے یہ منصب حالت کے لحاظ سے مناسب نہ تھی تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شایستگی کا جو درجہ قائم ہو گا وہ اس سے مختلف ہو گا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہو“ (دیباچہ سفر نامہ)

اس دیباچے سے یہ تو ظاہر ہو کہ ولانا کا سفر محض علمی تھا اور سفر نامہ سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ تربیت قیام بھی مختصر تھی مولانا ملکی زبان سے واقف نہ تھے زیادہ تر مصروفیت کتب خانوں اور مدرسوں کے دیکھنے میں رہی مولانا ملکی دین الاقوامی سیاست سے نہ تو واقف تھے نہ واقفیت کی کوشش کی نہ سیاسی جماعتوں کے ارکان سے ملے، ان کے پیش نظر قدیم کے سفر نامے بھی تھے، اور سفر نامے کی غرض و غایت بھی اچھی طرح جانتے تھے ان امور پر غور کرنے کے بعد سفر نامہ لکھنے کے متعلق مذہب ہو گئے اور آتے ہی موصوفات کو ایک چلتا ہوا فقرہ لکھ دیا کہ ”اب تک لکھنے کا ارادہ نہیں“ مگر اب یہ مختلف حیثیات پہلی تخلیق واقعات و اسباب کے بحث شروع کرتے ہیں کہ

”لیکن ان اسباب میں سے جو پہلی سبب تھا (۱) اسباب بھی پردہ پڑا ہوا ہو

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ روم و روس کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دل چسپی ترکوں کے ساتھ بڑھ رہی تھی حالانکہ اس جنگ میں انگریزوں نے بڑا کامیاب کام کیا تھا اور ان ہی کے اشارے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کے لیے چندے کئے تھے اور بڑا جوش پھیلا تھا پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی کے ساتھ یہ عقیدت دل سے بند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سر اسر لوہانیوں کے ساتھ تھی مگر کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی اس کی ہندوستان کے مسلمانوں کو جو غیر معمولی خوشی ہوئی اور تمام ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی گئی جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کا منہ چڑایا گیا اسی لیے سرسید نے جوہر مال میں انگریزوں کو راہی رکھنا چاہتے تھے مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا اور اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ترکی کی یہ عقیدت جاتی ترے اور اتحادِ اسلامی کی جو تحریک جو پکڑ رہی ہو وہ کم زور ہو جائے مولانا کا ترکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان اور ترکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سیرتِ ترکی گئے۔ قسطنطنیہ کے قیام کے زمانے میں اپنے جوش و خروش کو پوری طرح دبانے کے باوجود وہ شیر پلونا جنرل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے اور ان سے متفقہ مجیدی کا تختہ ہندوستان لائے، اس واقعے نے اندر ہی اندر انگریزوں کو اس کے اربابِ بخت و کشادہ کو چراغِ پا کر دیا اب یہی حال

جنگ کے موقع پر انھوں نے خود فائدہ کھولا تھا اور چندہ جمع کر کے بھیجا تھا۔ ترکی کے مشفق انڈی ٹیوٹ گزٹ میں اہم مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں وہ ہرلینڈی سید احمد غلو صی سفیر دولت عثمانیہ کی جو دہلی آئے ہوئے تھے پر دو گرام تبدیل کر کے علی گڑھ لائے جن کے ساتھ فونسل پریل منعینہ بمبئی اور دیگر ارکان سفارت بھی تھے انھوں نے کالج کے نشان میں بھی ہلال کو رکھا اور کالج یونی فام میں ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی رکھی، اسی زمانے میں انہیں بلکہ اسی ہفتے میں جب کہ مولانا کا خیر مقدم ہوا ایک ترک افسر (امیر علای شاکر آفندی ڈاکٹر دولت عثمانیہ مامور برائے تحقیقات ہینے) ۲۲ نومبر کو علی گڑھ آئے اور پروفیسر مارسلین اور کالج کے بورڈرپا نے ان کی الگ الگ دعوتیں کیں، بورڈروں کی طرف سے سالانہ منزل میں دعوت ملتی، اس میں مسٹر آرنلڈ (پروفیسر) نے ایک مختصر تقریر میں ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے اس گنجائش و اتحاد کا ذکر کیا جو سلطنتِ برطانیہ اور دولت عثمانیہ میں ایک عرصے سے قائم ہو اور جو کہ ملکہ معظمہ اور سلطان المعظم کے مابین نہایت اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا ہو۔ (مولوی) بہادر علی (طالع سلم) نے سلطان المعظم کا جامِ صحت بر زبان عربی تجویز کیا اور اس تعلق کو بیان کیا جو پوچھا اور اخوتِ اسلامی سلطان کو تمام مسلمانوں سے ہو اور جو تمام پولیٹیکل اور سوشل تعلقات سے زیادہ مضبوط ہو، پھر مولانا شبلی نے عربی میں جہان کے کالات و فضائل اور سلطان خلافتِ پناہ کی شاندار توجہ اور انتہات کو بیان کیا جو ہر ملک اور ہر خطے کے مسلمانوں پر مبذول ہو اس کے بعد اپنی وہ پرجوش نظم پڑھی جو بروز عیدِ خطینہ میں لکھی تھی اور جب ایک مصرعے میں سلطان المعظم کا نام آیا تو آفندی احمد روح اور ان کے ساتھ حاضرین نے سرِ دق تعظیم ادا کی، آفندی نے ترکی زبان میں نغزہ کی اور مولانا شبلی نے اس کا ترجمہ سنایا، اس زمانے میں

اتفاقاً سرسید آباد میں تھے انہوں نے اس جہلہ دعوت کی یہ روئے اوجو اسی ہفتے کے انشا
 میں شائع ہوئی تھی ملاحظہ کی تو ”مبارک باد“ کے عنوان سے نوٹ لکھ کر بھیجا جس میں اس
 کے نہایت ذہان و شوکت اور خوش اسلوبی سے مستعد ہونے پر اظہار سرست کر کے مبارک باد
 دی تھی اور افسرانِ کالج اور لبرڈوں کی کارروائی پر پرجوش ہلکر یہ ادا کیا تھا یہ روداد اور
 مبارک باد انسی ٹیٹ گزٹ نومبر و دسمبر میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا شبلی اسلامی ہندوستان اور ترکی کے تعلقات کی پہلی کراہی نہ تھے نہ اسلامی
 ہند کے پہلے سفیر تھے اسی قریب زمانے میں دہاس کے ایک تاجر عہدۃ التجار حاجی محبوب الرحمن
 پاشا علائقہ دہاس کے سفیر دولت عثمانیہ مقرر ہوئے تھے اور مستند و اصحابِ ترکی کا سفر کر چکے
 تھے اور مستند و لوگوں نے ترکی کی علانیہ حمایت کی تھی ۱۸۸۷ء میں حاجی محمد اسماعیل حناں
 رئیس دتاؤلی (علی گڑھ) نے عرب یورپ اور ترکی کی سیاحت کی اور شگاشت فرنگستان
 کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ ۱۸۸۷ء میں نواب رسالہ جنگ تانیہ تسلطیہ گئے سلطان
 سے ملاقات ہوئی اور سلطان نے درجہ اول کا تہفہ مجیدی دینا چاہا مگر انھوں نے بلا اجازت
 حضور نظام قبول کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انگلستان اگر مسئلہ شرعی اور مسئلہ ترکی پر مضامین
 لکھے (خط مندرجہ اخبار سرگزشت علی گڑھ)

۱۸۸۷ء میں نواب محسن الملک جب غائبانہ نظام کی حیثیت سے پارلیمنٹری کمیٹی کے
 سامنے ایک مقدمے میں اولے شہادت کے لیے گئے تو اس وقت کے وزیر داخلہ
 (مشہور دشمنِ ترکی) انگلیڈ ایٹون سے بھی ملے اس ملاقات میں اساطیلِ سیاسی پر کئی گفتگو
 ہوئی اور نواب مدوح نے ترکی کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے جذبات و ارض طبعانہ ظاہر
 کیے یہ گفتگو انگلستان کے اخبارات میں شائع ہوئی اور لندن ناٹرنے تو وزیرِ اعظم سے
 جواب پرتیقہ دہی کی (تذکرہ محسن)

کی ایک سوسائٹی میں ترکی سلطنت پر ایک تاریخی لکچر دیا جس میں سنہ ۱۲۵۳ تا ۱۸۷۷ء کے واقعات اور انگلستان اور ترکی کے تعلقات پر روشنی ڈالی اور خود بھی ترکی کا سفر کیا۔

مہلا ناشی نے توسن نامے میں ملحق و معاشرتی حالات پر انگلیا مگر خادم التسلیم پریس لاہور نے سلطان عبدالحمید ثانی کے دوازدہ سالہ عہد حکومت پر ایک انگریز خاتون کی کتاب کا ترجمہ شائع کیا: الفضل ما شدت به الاعدا کی مصداق تھی۔

۱۸۹۱ء میں ای مولوی، فیصل احمد پروفیسر علی گڑھ کالج نے گریسی کی مشہور کتاب "عثمانی ترک" کی پہلی دس فصلوں کا ترجمہ "کارنامہ ترک" کے نام سے مطبع مستبائی دہلی میں چھپوایا۔

مولانا کو درجہ چہارم کا تمغہ مجیدی ملنا کوئی اونکی بات نہ تھی مستحکم کی جنگ کے بعد جن لوگوں نے چندے کر دیئے تھے ان کو بہ کثرت یہ تمغے دیئے گئے اور سلطان عبدالحمید ثانی نے تو انتہائی فیاضی سے تقسیم کیے۔ سنہ ۱۸۷۷ء تک علی گڑھ کے دو اصحاب جو موثر تیار گئے ان کا نام گرام ہیں (ہاجی مصطفیٰ خاں رئیس بڑا جگہ دار اور ہاجی عبدالکھلیل خاں) نہ صرف اسی تمغہ سے شرف ہوئے بلکہ بارگاہ سلطانی میں بھی بار بار ہوئے۔ بیسی کا خاندان فیضی جو جوئے تک بمبار تجارت قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور جس کے ساتھ مولانا کے تاریخی واقعات ہیں "نشان شفقت" سے سرفراز ہوا جو تمغہ مجیدی سے بہت افضل ہے۔

وہ بدگمانیاں اور شکوک جو منہ حیا سنیہ کی ہی تعلیمی و اجتماعی ہیں ان سب میں سے کہیں کہیں جتنے میں مذاکرے، سفر نامے کی ترتیب میں نہ ہر وہند سیاسی نہ نہایت اور اجازت بحریہ وہ مائل ہیں جو صحت مصنف ہی کے بڑے دلچسپی سے نگلی ہیں سرسید اور مولانا کی تحریروں میں تو کئی وجوہ ہیں۔

طبعاً سرفارمانہ کو بھی اپنی یقینی یا د قیہ روی سے ایک اقتدار بنا کر بنا کر دیا، حالانکہ بات یہ تھی کہ طبع کی طرف سے مولانا کی یہی کتاب شان محمدیہ کا ترجمہ تھا۔

انہوں نے کالج کو پاس فرمائے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھا تھا اسی لیے اپنے اہستام سے اسی مطبع میں چھپوایا جس میں کالج کا تمام تنگی طباعت کا کام ہوتا تھا، کیوں کہ انسٹی ٹیوٹ پریس میں لپیٹو نہ تھا۔

صفحہ ۵۸۷ پر مصنف لکھتے ہیں کہ ”اس زمانے میں ترکوں کا نام لینا بڑا گورنمنٹ کی سیاسیات کی نگاہ میں بڑا جرم تھا۔ مولانا نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور ہر چند کہ ترکی کے سفر نامے کی ترتیب میں اس کا علمی و تعلیمی ہی پہلو پیش نظر رہا سیاست کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا مگر یہ خفیف جرم بھی عفو و درگزر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ان کو سلطانی انجلی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی۔ انہما یہ ہو کہ مولوی عبدالرزاق کان پوری مصنف البراکہ نے اس سفر نامے پر ریویو لکھا تو نکاپور کے کلکٹر نے ان کو بلوا کر ڈانٹا کہ تم برطانی رعایا ہو کر سلطانِ روم کی تعریف کرتے ہو اور مولوی صاحب کو معذرت کرنی پڑی۔“

حاشیہ پر یہ نوٹ بھی ہو کہ ”یہ دونوں واقعے مولوی عبدالرزاق نے جو مولانا کے اسی زمانے کے ملنے والے اور درست ہیں اپنے مضمون ”یادایام میں لکھے ہیں“ لیکن یہ مضمون ہنوز کہیں شائع نہیں ہوا۔

مصنف نے اس واقعہ کا تو حوالہ دیا لیکن اس سے اہم حوالہ جو ایک ایسا واقعہ ہو جس سے صاحبِ حیات کی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہو قصداً چھوڑ دیا جس کو ہم مولوی عبدالرزاق صاحب کے مسودہ سے ہی پیش کرتے ہیں :-

یادایام نمبر ۶ بشلی نعمانی

مولانا بشلی نعمانی کے متعلق میں نے جس قدر لکھا، ہودہ ان کی مفصل سیرت

جلد ۱۰ یہ رسالہ ابھی طبع نہیں ہوا۔

ہیں بلکہ یہ متفرق حالات ہیں یا وہ لطافت ہیں جو بیخ کی صحبتوں میں پیش آئے
مولانا کی نسبت میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سرسید احمد خاں مہار کی دوازدہ سالہ
صحبت سے ان کو از حد نفع پہنچا اور شبلی سے شمس العلماء مولانا شبلی ہو گئے اور ان
میں روشن خیالی، بلند نظری پیدا ہوئی اور وہ ٹھیکٹ مولویت جو دماغ پر محیط تھی
جاتی رہی اس کے ثبوت میں وہ مذہبی رسائل ملاحظہ ہوں جو مولانا نے ابتدائے لکھے
لیکن باوجود ان حالات کے افسوس ہے کہ مولانا نے اپنی کسی تصنیف میں فراخ ذہنی
سے سرسید کا نام نہیں لیا۔

سرسید احمد کی پہلی برکت تو یہ تھی کہ مولانا نے سید کی فرمائش سے گزشتہ
تعلیم مسلماناں "پر ایک مقالہ لکھا چنانچہ یہ مضمون ان کی آئندہ تاریخ نگاری کا
دیباچہ بنا اور اسی سلسلے میں مدرستہ العلوم کی پروفیسری بھی ہو جس پر مزید روشنی
یہ پڑی کہ ان کی پروفیسر آرٹلڈجیسی فلسفی کی شاگردی نصیب ہوئی اور ان سے فریج
زبان حاصل اور دیگر مغربی و مشرقی علما جداگانہ تھے اگر یہ ماحول نہ ہوتا تو مثل دیگر
مولویوں کے وہ بھی ایک متعصب تلامہ ہوتے جس کے نظائر بے شمار ہیں۔ نیز احمد خاں
ایک عالم جلے میں ان کو کوہی کہ کر مشور عام کر دیا یہ لطیفہ مولانا کے لکھنؤ میں لکھا گیا علاوہ بریں فارسی
اور اردو شاعری میں شمس العلماء مولانا شبلی نے جو ترقی کی اور منظر عام پر آئے یہ سب مدرستہ العلوم کی علمی
زندگی کا نتیجہ تھا اور عمر کا اخیر حصہ مذہبی خدمات میں صرف کیا حقیقت یہ ہے کہ ان کی رحلت سے لطیف
زندگی جاتا رہا اور مجھ کو جو صد پہنچا وہ قابل اظہار نہیں۔ افسوس ہے۔ ع
وہ جو بچتے تھے وہ اے دل وہ وہاں اپنی بڑھا گئے۔

بہ صورت اشتباہ ایسے سیاسی معاملہ میں خفیہ پولیس حکومت لگاتی ہے اور یہ
بھی ضرور تھا کہ افسران کالج کو اطلاع دی جاتی اس صورت حال میں مولانا کالج
سے رخصت کر دیے جاتے مگر ان کو تو ۱۲ ماہ بعد ہی خطاب ملتا ہے ایک

بدگمان و توفیق کے ساتھ کہہ سکتا ہو کہ مولانا خود حکومت برطانیہ کے جاسوس بن کر نرنگے لگے تھے اور مسٹر آرنلڈ کے زیر ہدایت انھوں نے وہ خدمات انجام دیں جن کے صلے میں ان کو شمس العلماء بنایا گیا۔

مولوی عبدالرزاق کا بیان قابل یقین ہو وہ یہ بھی نہیں بتائے کہ کس اخبار میں ریویوشائع ہوا بہر حال کسی اخبار میں شائع ہوا ہو اُس کا مالک ناشر بھی برطانوی عایا تھا اس کو بہت زیادہ فنیہ کی بجائی کیوں کہ مضمون نگار سے زیادہ دقتے دار ناشر ہوا کرتا ہو مگر اس کا کوئی ذکر نہیں پھر کس قدر حیرت ہو کہ سفر نامہ شائع ہوتے ہی چلائی اور اگست میں مولوی وحید الدین سلیم اور شمس العلماء خان بہادر مولوی دکار اللہ خاں کے معترفانہ ریویو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ہی شائع ہوئے مگر کسی سے پرسن وجوہی اور ایک معمولی مضمون نگار کے ریویو پر یہ نوٹس لیا جاتا ہو۔

اس سلسلہ بیان میں چند اوزکات بھی قابل غور ہیں (۱) مولانا شبلی کو نہایت بلند آہنگی سے جمہوریت پسند ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور یونین کی تقریر کو ثبوت میں دکھایا گیا ہو جس تقریر کے بعد مولانا سفر روم کو روانہ ہوئے ہیں اور تین مہینے قسطنطنیہ میں ان کا قیام رہا ہو۔ یہ تاریخی واقعہ گزر چکا ہو کہ سلطان عبدالحمید نے سخت نشین ہونے سے قبل جس پارلیمنٹ کا وعدہ کیا تھا اس کو نوث پر قدم رکھتے ہی قائم نہ کر دیا مگر بہت جلد توڑ دیا اور مدحت پاشا کو جس سے یہ وعدہ کیا تھا اور اس کو صدر اعظم بھی بنایا تھا گرفتار کر کے قید کر دیا اور بالآخر طرح طرح کی ذلتوں سے مراد والا، اس زمانے میں اصلاحات کا تخیل بھی جرم تھا اخبارات و جرائد کی زبان بند کر دی گئی تھی تقریر و تحریر کی آزادی نہ تھی (مولانا اس پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں) قصر یلدرم جاسوسی کام کر رہا ہوا تھا سازشوں کی گرم بازاری تھی، اتحاد اسلامی کی تحریک کے علم بردار یا داعی سید جمال الدین افغانی بھی قسطنطنیہ میں مقیم

تھے عرب ممالک میں مرکز خلافت کے خلاف جذبات برافروختہ تھے مصر ہاتھ سے نکل چکا تھا بلقانی ریاستیں آزاد ہو چکی تھیں اور دولت عثمانیہ کی بقا یورپا و خصوصاً روس و برطانیہ کی رقابت کی رہنمائی تھی کیوں کہ ترکی کی بحری و بری فوجی طاقت اتنی بھی نہ تھی کہ کسی ایک سلطنت کا مقابلہ کر سکے۔ سلطان نے سلطنت کے ساتھ دنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے تحریک خلافت شروع کی تھی جو سید جمال الدین کی تحریک اتحاد اسلامی سے جدا چیز تھی اور دونوں کا نقطہ نظر مختلف تھا، ان تاریخی واقعات کو (جو ناقابل انکار ہیں) پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ اگر مولانا شبلی جہوریت کے دلدادہ اور پین اسلامی تھے تو سلطان عبدالحمید کی رحمت طرازی کیا سہنی رکھتی ہو پھر ایسی رحمت جس میں کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ ناموزوں بھی ہو جائے۔

قاعدہ دولت و دیں را مدار	آئینہ رحمت پر در گار
شاہ فلک کو کعبہ عبد الحمید	ایہ اللہ بنصر مزید
جز تو کہ ہست اے شبہ انجم سپاہ	آں کہ بود شرع نبی را پناہ
ما از گی بدر و جنین از تو ہست	زیب و طراز حرمین از تو ہست

مصنف ان اشعار کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ "مگر یہ حقیقت کیوں تھی کیا محض اس لیے کہ دولت و فروت اور جاہ و اقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا تھا، نہیں بلکہ اس لیے کہ اس جاہ و چشم کے آئینے میں ان کو اسلام کی حیات ملی کا تابناک چہرہ نظر آ رہا تھا..... یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی نہ مدوح کو منکر جملہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا جو بے ساختہ زبانِ قلم سے تراوش کر گیا ہو۔" (۲۰۶)

۱) حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا شبلی کو اس وقت تک نہ تو سیاست سے کوئی لگاؤ

تھا اور نہ بین الاقوامی سیاست کی ہوا لگی تھی وہ ماضی کے بہترین داستان گو تھے لیکن مستقبل دیکھنے کی نظر نہ تھی دو اب تک ترکی کے زوال سے جو سال ۱۸۷۷ء سے شروع ہو کر سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں تیزی سے ترقی پزیر ہوتا تھا ناواقف محض تھے۔ ورنہ قومی حیات کی رجز خوانی نہ کرتے اور نہ تقاضائی کا جوش اہریں لاتا، مولانا جذبات کی رو میں بہ جاتے تھے۔ سلطان کا یہ ظاہری طمطراق اور شان و شوکت ہی دیکھ کر بے قابو ہو گئے اور دیوانہ وار پکار اُٹھے۔ ہم تازگی بدر و جنین اور نویست پھر اس وقت تک سلطان کو کس جنگ میں فتح حاصل ہوئی تھی کہ ایتھاندر بصرہ زید، کی دعا صادق آتی مولانا خود اپنی سیاسیات کے اسنے کنارہ کش لیے کہ سلطنت میں سید جمال الدین افغانی تک سے نہ ملے جو علمی و سیاسی شخصیت و شہرت رکھتے تھے سلطانی مہمان تھے اور ہندوستان کا سفر بھی کر چکے تھے۔ مولانا کا دائرہ ماقات صرف علمی احکام تک محدود رہا اس لیے ان کے سفر نامے میں کسی سیاسی زیر کا دھم بھی نہیں برسکتا، نہ ان کا مسلم ملک پر کوئی سیاسی اثر تھا اور نہ مذہبی تقدس اور علانہ دہشت تھی، نہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی حیثیت سے وہ پبلک پلٹ فارم پڑائے تھے وہ صرف ایک سرخ وادیب اور شاعر کی حیثیت سے مہارت و شہرہ رکھتے۔

تمغہ حمیدی ظاہر ہو کر بغیر سفارش نہیں مل سکتا تھا، جین جیب آفسری ہندستان میں سفیر رہ چکے تھے اور علی گڑھ تحریک سے واقف تھے جو انہیں کے زمانہ سفارت میں شروع ہوئی تھی بلکہ وہ خود قاضی اسکریڈا اور غلامی کے ساتھ ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ آچکے تھے اور اب علی گڑھ کی شہرت و ماکہ اسلامیہ تک پہنچ چکی تھی (جیسا کہ خود مولانا نے اپنی تقریر میں بیان کیا) مزید برآں مصنف کی روایت سے جب کالج میگزین جلا کاہ حیثیت سے شائع ہونے لگا تو مترجم وزارت خارجہ نے ایک چھٹی کے ذریعے اس کو اپنے نام جاری کرایا۔ محمد ن کالج ہٹری (۱۷۸)

کے مطابق مولانا کے نام سے بھی چندہ مجروحان ترکی کے سلسلے میں اسی زمانے سے آستانے، اس صورت میں ہندوستان کے ایک بڑے مسلم تعلیمی ادارے کو مرمون بنانے کے لیے ایک اعلیٰ عہدہ دار پولیس کی سفارش پر متعینہ مجیدی درجہ چہارم کا بل جانا کوئی اہم بات نہ تھی، جو اس سلطان کے زمانے میں عام بات ہو گئی تھی۔

(۹) الفاروق کی تصنیف پر اختلاف رائے | علی گڑھ کی زندگی اور سرسید کے تعلقات

میں الفاروق کی تصنیف کے واقعے کو بھی مصنف حیات شبلی نے ایک عجیب و غریب رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے آٹھ صفحے ۲۳۲ تا ۲۳۶ وقف کیے ہیں، لکھتے ہیں :-

”مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ الماسون کے بعد ہی کیا تھا بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی لیکن تاریخ طبری جو اس کے لیے بہت ضروری کتاب تھی وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی اس لیے کچھ دنوں کے بیٹے ترک جانا پڑا..... سیرت النعمان کے دیباچے میں جو جزوی سلسلہ میں شائع ہوئی وہ رقم طراز ہیں

”یہ واقعہ بھی قابلِ غماز ہے کہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اول میں نواب محسن الملک سید ہدی علی خان نے حضرت غرغریہ ایک مضمون لکھا تھا جس کا ماخذ چارکنہا میں (۱) تاریخ یافعی (۲) تاریخ الخلفاء (۳) ازانہ لفظا (۴) تاریخ طبری تھیں جیسا کہ حاشیہ مضمون پر درج ہو۔ اس طرح الفاروق کی تاریخ بل تو پر مبنی تھی اور تاریخ طبری بھی موجود تھی مولانا شبلی کو اسی مضمون سے مستقل تصنیف الفاروق کا خیال پیدا ہوا اور نواب مدوح نے بھی اس میں ایسی تصنیف کی طرت توجہ دلائی ہو۔ یہ امور جی گہم نے میان کیا وہ بطور نمونہ کے ہیں مگر حالات تفصیل سے لکھے جائیں تو ایک بڑی کتاب ہو جائے۔“

(تہذیب الاخلاق جلد اول)

المامونؑ کے بعد میں نے الفاروقؓ لکھنی شروع کی تھی اور ایک مہینہ بعد
 لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبور یوں سے چند روز کے لیے اس کی
 تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں
 کیں حالاں کہ بات اتنی تھی کہ بعض نادار کتابیں جو اس تصنیف کے لیے
 ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر
 نہیں آچکیں "مولوی حبیب الرحمن شیردانی کے مضمون سے بھی
 اس بات کی تائید ہوتی ہو کہ بعض نادار کتابیں ہندستان میں میسر
 نہیں آئیں اور ان کے مالک اسلامیت کے سوا "ایک مقصد الفاروق
 کے واسطے مواد فراہم کرنا اور ان کتابوں کا دیکھنا تھا جو ہندستان میں موجود
 نہ تھیں" خود مولانا نے اپنے سفر نامے کی تہذیب میں لکھا ہو کہ جس زمانے
 میں مجھ کو ہیر و آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ
 ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہو وہ اس مقصد کے لیے
 کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ یہی خیال تھا جس نے ادلی ادلی سفر کی تحریک
 دل میں پیدا کی کیوں کہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات
 کا جو بقیہ رہ گیا ہو ان سے ایک ایسا سلسلہ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہو
 کوتاہ بینوں کی جن بدگمانیوں کی تردید مولانا نے کرنی چاہی ہو
 اُن میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی اور وہ کالج کی وہی
 مصلحت بینی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں
 میں سُنی اور شیعہ کا فرق پیدا کرے۔ اس زمانے میں کالج کے ہمدردوں میں
 سب سے قابلِ تعظیم نام نواب عہد الملک سید حسین بکراچی کا تھا سرسید
 کا خیال تھا کہ چون کہ وہ شیعہ ہیں اس لیے یہ کتاب کالج سے ان کی

بد مزگی کا سبب ہوگی یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہر روز فیصلہ نہیں ہو رہا تھا لیکن مولانا نے اس کے کھٹے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اس لیے وہ اس مصلحت پر کاربند ہونا نہیں چاہتے تھے۔

بلاشبہ نواب عماد الملک کالج کے ہمدردوں میں تھے لیکن ان سے بہت زیادہ ہمدرد اور دزولے نظام پر اثر رکھنے والے محسن الملک اور وقار الملک تھے ان کی ذاتی امداد میں بھی عماد الملک سے بہت زیادہ تھیں ان میں محسن الملک شخص تھے جنہوں نے تشیح سے تسنن اختیار کیا تھا اور شیعوں کے لڑکیوں میں اپنی مشہور و معروف کتاب ”آیاتِ بینات“ لکھی تھی اور حضرت عمرؓ پر بھی مضمون لکھا مگر ان کے ساتھ عماد الملک کی کوئی بد مزگی نہ تھی اور نہ عماد الملک اس طبیعت کے آدمی تھے کہ اپنے تشیح کے سبب کسی پروفیسر کے ایسی کتاب لکھنے پر بد مزہ ہو جائیں اور اس ادارے کی امداد سے دست کش ہو جائیں جس میں کہ مصنف صرف ”الزمانہ“ حیثیت رکھتا ہو،

اب ایک اور ایجاو ملاحظہ طلب ہو کہ

”بالآخر یہ طوطا پاکہ یہ سلسلہ خود نواب صاحب مدوح کے سامنے پیش کر دیا جائے چنانچہ سرسید نے ان کو خط لکھا ان کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا یہ آیا کہ اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا، جو وحیف ہو کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جہلے اور ساتھ ہی مولانا کی تعریف و تحسین بھی کی“ حاشیہ پر اس کی تائید میں مولانا شروانی کا ایک بیان درج ہو کہ ”مولانا جب سرسید کے روکنے سے انکار و قی کے مصمم ارادہ ترک نہ کر سکے تو سرسید عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو انہوں نے جواب میں لکھا کہ اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہو لہذا ان کی سوانح لکھنے سے مولانا

شبلی کو نہ روکیے، سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کر دیا کہ وقت پر کام آوے۔ یہ واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا:

بیانات بالا سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ عماد الملک کو اختلاف نہ تھا مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان کے خط کو بہ اس غرض سپرد کرنا کہ وقت پر کام آوے کیا معنی رکھتا ہے اس کے بعد سرسید کے ایک خط مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کا حوالہ ہے جس سے یہ ثابت کیا ہے کہ ”نواب عماد الملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف تھا اس سے زیادہ خود سرسید کو تھا“ لیکن عماد الملک کو اختلاف ہی کب تھا زور سنی کے لیے یہ مزید اختلاف پیدا کر لیا گیا اور جس طوفانی خط کا حوالہ ہے اس میں الفاروق کے متعلق صرف یہ فقرہ ہے کہ ”الفاروق کی نسبت جو آپ نے تحریر فرمایا وہ سب درست ہے مگر اس کے ساتھ فیہ مافیہ بھی ہے اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ مافیہ کو صاف صاف مثل ایسے مؤرخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو لکھے تو بلاشبہ نہایت عمدہ بات ہو مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے اگر نہ کریں گے تو کتاب ردی ہوگی“

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید کو یہ اعتماد نہ تھا کہ مولوی شبلی اس فیہ مافیہ کو ایسے مؤرخ کی طرح لکھ سکیں گے جو کوئی مذہب نہ رکھتا ہو اور اس وجہ سے کی یہ کتاب ردی ہوگی، قرینہ چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب ہوگا جو سرسید نے مولانا شبلی کو دیکھنے کے لیے دیا ہوگا، اتنی سی بات حق۔ جسے احسانہ کر دیا۔ تاہم وہ کسی اور کے مقابلے میں مولانا شبلی میں اس کام کی سب سے زیادہ قابلیت و اہلیت کے معترف تھے چنانچہ اسی قریب زمانے میں سرسید کے ہی عقیدت مند مولوی سراج الدین احمد نے سیرۃ الفاروق شائع کی تو انھوں نے انسی ٹیوٹ ٹرسٹ ۱۰ مارچ ۱۸۵۸ء

میں ایک مضمون لکھا جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور مصنف سیرۃ الفاروق کی جلد بازی پر اظہار افسوس کیا، اور لکھا کہ۔

”اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیتِ علم اور کیا بنظرِ عمدگی تالیف اور کیا بنظرِ ترتیب مضامین یا دوگانہ سیرۃ الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت اس کا سامان جمع کیا تھا جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہو اور نہ ہر ایک شخص کا کام ہو اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہو تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد کو بلاشبہ مناسب نہ تھا اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے بلکہ اس رحمت کے منظور ہوتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی“۔ ... جو کام ان کو نہ کرنا چاہیے تھا انھوں نے کیا بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے محذوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہو..... جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا اور اگر ایک ہی مضمون پر دو شخص لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نازلی ہوگی بس ان کو کیا پروا ہو کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہو مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگانِ دین کو بھی ہیر و زآف اسلام میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ ان سے متفق ہیں وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں نہ ہیر و زآف اسلام، اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد الغزالی یعنی لائف امام غزالی لکھ دیں جو نہایت دل چسپ اور بے حد مفید ہوگی خدائے کو تو فیق دے کہ ہماری بات کو مابین اس کے بعد جو خدا کو منظور

ہو وہ کریں لیکن اگر اس کے بعد بھی انہوں نے الفاروق کلمی تو ہم اس وقت ان کو جو کہیں گے کہیں گے ۛ

ان واقعات اور تحریروں کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی مصنف حیاتِ نبلی نے جو بدگمانیاں کی ہیں ان کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، بلکہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کا اختلاف محض ایک ایسا مشورہ تھا جو ایک شفیق مرتی اپنے ایک نہایت عزیز کو جو اس کا تربیت یافتہ ہو اور اس سے امیدیں بھی وابستہ ہوں بعض نازک موقعوں پر جو اس کی طاقتِ عمل سے خارج سمجھتا ہو محبتِ الفت سے دیا کرتا ہو۔ اور جب وہ عزیز اس کو قبول نہیں کرتا تو وہی لفظ منہ سے نکلتے ہیں جو سرسید کے زبانِ قلم سے نکلتے کہ ”ہم اس وقت جو کہیں گے کہیں گے۔“ اس داستان میں یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ الفاروق کے متعلق سرسید کے جس خط (۲۷ مارچ ۱۸۷۷ء) کا حوالہ ہو اس کے بعد ہی مولانا ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد بھی سرسید کی ہمرہی میں جاتے ہیں نواب عماد الملک کے دولت خانے پر علمی محبتیں رستی ہیں اور ان محبتوں سے متاثر ہو کر مولانا ایک عربی نظم لکھ کر سرسید کو دیتے ہیں جو انٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع بھی ہوتی ہے لیکن اس مسئلہ زیر بحث کا کوئی ذکر نہیں آتا اسی طرح دسمبر ۱۸۹۷ء میں نواب مددوح علی گڑھ اگر سرسید کے یہاں ہوتے ہیں اس وقت بھی خاموشی ہو حالانکہ ایسے مختلف فیہ مسائل ان علمی محبتوں میں بہت دل چسپ اور اچھے اسلوب پر طرہا کرتے ہیں۔

اب مصنف اس کتاب کی تکمیل کے بیان میں کہتے ہیں کہ ”۸ جنوری ۱۸۹۹ء کو اس کے چھپ جانے کی بشارت دی جاتی ہو (مہدی افادی) ۹ فروری ۱۸۹۹ء اس کے مطبوعہ ادباق ایک سمہ تن شوق، عزیز دوست، مولانا شروانی کے پاس اس تاکید سے بھیجے جاتے ہیں کہ ابھی کوئی اور دیکھنے نہ پائے (شروانی) مولانا

کو اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نگین و اشاعت پہلے اُن کی کتاب کا مسودہ کوئی نہ دیکھنے پائے فراتے تھے کہ سرسید مرحوم الفاروق کا مسودہ اور اس کے چھپے ہوئے اجزاء دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے میں سکرکر یہ جواب دیتا کہ مشاعرے سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی۔ (۲۳۶ ۲۳۷)

مگر اس بیان میں مولانا شردانی کے نام کے جس خط کا حوالہ ہے وہ یہ ہے۔
 ”تسلیم خط پہنچا مسودہ مطبوعہ ارسال ہے نواب عبدالشکور خاں صاحب کو بھی دکھائے گا، لیکن ابھی زیادہ تقسیم منظور نہیں۔“

کس درجہ بعید از قیاس بات ہو کہ مولانا ایک ہمہ تن شوق حوزہ دوست کو تو اجزائے مطبوعہ یا مسودہ مطبوعہ بھیج دیتے ہیں اور اُن کے عم بزرگ (جو صرف ایک رئیس اعظم ہیں) کے ساتھ یہ خصوصیت برتی جاتی ہو کہ خود ہی ان کو دکھانے کی درخواست کرتے ہیں لیکن سرسید جو ہمہ تن مولانا کے مربی و مونس تھے اور جن کو مولانا قبلہ اور مطاعی لکھتے تھے اور جنہوں نے مولانا کو یہی اس کتاب کے لکھنے کا سب سے زیادہ اہل ترار دیا تھا انھیں نہ صرف متعدد مرتبہ مطبوعہ اجزاء دکھانے میں مغل کیا جاتا ہو بلکہ عر و مرتبہ کا لحاظ اور حفظ مراتب کا پاس بھی نہیں کیا جاتا اور وہ جواب دیا جاتا ہو جو تہذیب ادب کے بھی منافی ہے۔ مولانا شبلی کے اکل کھڑے پن کی شکایت تو اکثر سنائی گئی اگر غیر متدب ہونا تو کسی کے وہم و خیال میں بھی نہیں آیا سرسید سے زیادہ مولانا اپنی خنث اور فنیہ مافیہ کے ہفتخوان کو طو کر لینے کی داد کس سے پاسکتے تھے۔ مصنف کا پرواز بیان ہو کہ سرسید نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ اشتیاق ظاہر کیا اور وہی (نامعقول) جواب سنا لیکن سرسید کی خود داری کبھی اس جواب کو سننے کے بعد دوبارہ اشتیاق ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی بلاشبہ مولانا کسی کو مسودہ نہیں دکھاتے تھے مگر استشنا بھی تھا چنانچہ

انہی شروانی صاحب کو لکھتے ہیں کہ ”ہاں ایک امر بڑا ضروری یہ ہے کہ میں علم کلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں آپ کے پاس بچوں کا (اور اس شاگردی کی نسبت میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی) آپ دیکھ کر بتائیے گا کہ کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہو گا؟“ (شروانی ۲۷) اسی طرح سیرت النبی صلعم کے مطبوعہ دیباچے پر جب دو یورپ نے نزع کیا تو مولانا محمود حسن اور مولوی عبداللہ صاحب ٹوکی وغیرہ کو اصل مسودہ دکھانے پر آمادہ ہو گئے جس کا تذکرہ راقم کے موصومہ خطوط میں ہو جو مکاتیب شبلی حصہ اول میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب (الفاروق) کی اشاعت کے نواب عماد الملک ساہا سال زندہ ہے اور مولانا سے ملاقات و مراسلت بھی رہی مگر الفاروق کے متعلق ان کی تحنیں و آفرین کا ایک لفظ بھی حیات شبلی میں نظر نہیں آتا۔

۱۔ خطاب شمس العلماء اور تبریک تہنیت کے جلسے :-

”مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آ رہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادار روزگار کی قدر افزائی سلطان روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدر شناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلے میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہو کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحاد اسلامی کے مبلغ اور سلطان روم کے سفیر بن کر ہندستان آئے ہیں۔ اس لیے ان کو ضرورت ہوئی کہ سلطان روم کے اس فرضی سفیر کو ممنون منست بنایا جائے اس کے لیے ابتداً خود سرسید کی طرف سے ہوئی۔ ڈپٹی سید زمین الدین صاحب (علی گڑھ) کا (جو اس وقت کانپور کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے) نے ان کے لیے ایک خط لکھا جس میں ان کی تعریف کی گئی تھی اور ان کے لیے ایک خط لکھا جس میں ان کی تعریف کی گئی تھی۔“

کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چھٹی لکھو اگر گورنمنٹ میں بھیجی کہ
 شبلی جیسے فاضل کی قدردانی نہ کی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ متمنہ مجیدی عطا
 فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہو کہ اس فرض سے
 غافل رہے، اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہو کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۱ء کو
 مولانا کو شش العلما کا خطاب دیئے کا اعلان کیا..... مولانا کو شش العلما
 کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا لیکن
 چون کہ سرسید کے کالج میں اس کے کسی پر و فیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا
 واقعہ تھا اور سرسید کے رفقاء اس کی پہلی نظیر تھی اس لیے اس سے
 اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا“ (۲۳۷ د ۲۳۸)

مولانا کا مبلغ اتحاد اسلامی بن کر لوٹنا سفارت سلطان اور فرضی سفیر کو مرہون منت
 بنانا یہ سب فرضی باتیں ہیں جن کا کوئی دُور کا شائبہ بھی کہیں نہیں پایا جانا، اگر بدگمانی
 پھیلنا صحیح بھی مان لیا جائے تو اُس کا تعلق حکومت ملکہ معظمہ اور حکومت ہند کے وفار
 خارجہ سے ہو سکتا ہو اور صوبے کی حکومت کے ذریعے سے پرنسپل اور سرسید کو اس کی اطلاع
 دی جاتی نہ اگر نہ حکام نہایت محدود لفظ ہو اور خود اس لفظ سے ہی یہ فرضی بات معلوم
 ہوتی ہو البتہ یہ سرسید پر ایک اور حملے کی بنیاد بنائی ہو یعنی یہ کہ وہ بھی انگریز حاکم
 کے ہم خیال تھے اور انہوں نے مرہون منت بنانے کی ابتدا کی۔

خطاب کی سفارش بجائے خود ایک اہم تحریر ہو اور پھر ان مفروضہ حالات میں
 سید زین العابدین سے جو ایک طالب علم تھے اُن سے خط سفارش لکھوانا قرین نیاس
 نہیں اور بعید از احتیاط بھی ہو پھر جو مضمون بیان کیا گیا، یہ وہ سفارش کا نہیں بلکہ
 ملامت کا ہو مولانا کی شہرت کا انتخاب بھی نصف النہار کو نہیں پہنچا تھا بلکہ اعلیٰ تک افق
 پر ہی تھا بات صرف یہ تھی کہ اس صوبے میں دو کالج نہایت ممتاز اور یکٹ نہ حریف

تھے میونسٹریل کالج، الہ آباد اور ایم اے اور کالج علی گڑھ، پہلے کالج کے پروفیسر مولوی ڈاکٹر اللہ خاں صاحب (سرٹید کے خاص دوست) کو یہ خطاب مل چکا تھا اب اس موقع پر جب کہ ہر آنر سر اکلینڈ کالون نے جب کہ وہ سبک دوش ہو رہے تھے سرٹید کی سفارش پر کالج کی عزت افزائی کے خیال سے مولانا شبلی کو بھی یہ خطاب دلوایا جو اس وقت علوم مشرقی کے سینئر پروفیسر تھے۔

اس خطاب سے مقام کالج کے (جسٹا کا کام لیا گیا) ایک چل سی بات ہے۔
اس سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

اس وقت تک یہ خطاب نااہلوں کو نہیں ملا تھا اس لیے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت بھی تھی پھر مولانا کو جس سن و سال میں یعنی چھتیس سینتیس سال کی عمر میں، ان کے پیش روؤں اور ہم عصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا، ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم واقعہ بنا دیا اور اس لیے بڑے بڑے تہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں ملک کے اکابر نے تقریریں کیں۔ معززین نے مختلف گوشوں سے مبارک باد کے تار اور خط بھیجے اخباروں نے تہنیت کے مضامین لکھے۔

مصنف حیات نے ۲۶ صفحوں میں کالج کی دو سو سا بیسوں لجنہ اللادب اور اخوان الصفا کے مشترکہ جلسوں کی روداد حد درجہ ذاب حسن الملک کی تقریر عربی فارسی اردو کی تہنیتی نظمیں مولانا حالی کی عربی نظم (بن العیب الی الحبیب) مولانا کی تقریر شکر یہ سرکاری رسم خلعت کی روداد کمشنر کی تقریر مولانا کا تذکرہ سبب کچھ روح گردیا، مگر یہ نہیں بتایا کہ کالج کے علاوہ اور کہاں کہاں جلسے ہوئے جن میں اکابر ملک نے تقریریں کیں۔

مولانا کی تریز شکر یہ کہ اس فقرے پر ختم کیا ہے:-

”حضرات جب کہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا فکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہایت نا پسندی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کر لوں جو ان تمام احسانات کا سرچشمہ ہو یعنی ہمارا قومی کالج یہ لیکن تقریر کا قصہ آج بھر کا ہے۔
 چھوڑ دیا کہ یہ تو حضرات میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر وہ کوئی پرسنل اور ذاتی معاملہ ہو تو آپ ہر بانی سے ذاتی معاملے کی نسبت بھی مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں اس کو اس عام مجمع میں علانیہ ظاہر کروں یعنی کالج کے احسانات جو مجھ پر ہیں۔
 حضرات یہ سچ اور بالکل سچ ہو کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار با سکتا ہو تو اس کا آغاز۔ اس کی نشو و نما۔ اس کی ترقی۔ اس کی نمود۔ اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہو اسی کالج سے ہوا ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا یہ سچ ہو کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا۔ آپس کے مذہبی جھگڑے۔ مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو اور قوت و استحکام دینا۔ میں آج سے بہت پہلے فارسی میں شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجے کے تھے آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی شاعری کو اعلیٰ رتبے کی خیال کرتا ہوں بلکہ یہ مطلب ہو کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہو تو اس وقت پست تر تھی۔ غرض یہ جو کچھ میں نے سیکھا ہو اور جو کچھ ترقی کی ہو وہ اسی کالج کی بدولت ہو۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پر د فیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تہ بیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔
 اے مہراںِ اخوان الصفا و لجنة الادب۔ آپ یہ خیال فرمائیں کہ کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو علمی ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں

اور ماسٹروں کی علمی اور روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہو۔ اگر وہ طالب علم کو
گوئی۔ اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتا ہو۔ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں
کو شمس العلماء کر سکتا ہو

صاحبو۔ یہ محض ظاہر نہیں ہو بلکہ سرسبز غلط فہمی ہو کہ آپ اس کالج
کے فوائد کو یونیورسٹی کے کورس تک محدود سمجھیں علاوہ ان بہت سے فوائد
کے جو یہاں کی مختلف سوسائٹیوں مثلاً یونین کلب۔ انجمن التعلیم
لجنتہ الادب وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں اور جو اسی کالج کے ساتھ مخصوص
ہیں ایک خاص بات اور سب سے بڑی بات جو اس کالج میں پائی جاتی ہو
یہ ہے کہ یہاں ایسے اہل کمال جمع ہیں جن کی بدولت کالج بہت سے ایسے
مضامین کا درس گاہ کہا جاسکتا ہو جن کا نام و نشان بھی دوسرے کالجوں میں
نہیں مل سکتا۔ ہمارے کالج کے احاطہ میں سید محمود مولانا حالی۔ نواب
عسری الملک جمع ہیں اور اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کالج میں فن قانون
کا ایسا پروہنس وجود ہے جو جس کے نظیر سے تمام ہندستان کے قانونی سماج
محالی ہیں۔ ہمارے کالج میں شاعری اور فن شعر کا وہ پروفیسر موجود ہے
جو شاعری کا فارم اور ناعتمہ الشعرا ہو ہمارے کالج میں پائٹکس اور انتظام
کا وہ بڑا پروفیسر ہے جس نے حیدرآباد کی عظیم الشان ریاست کو انگریزی
طرز انتظام کے قالب میں ڈسالا ہو۔ کیا کسی کالج کی یونیورسٹی میں
قانون۔ شاعری۔ پائٹکس کے ایسے بے نظیر پروفیسر کوئی شخص دکھا سکتا ہو۔
حضرات! میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہو اس میں ایک
نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں کیوں کہ میرے نزدیک
نبینا اس کالج کا ایک کائنات کے متعلق جو میرے جبرئیل کا نام لیا جائے اس

ہیں اسی بڑے شخص کا جلوہ موجود ہے۔ معصوم
 بدھ دیکھنا ہوں اور تو ہی تو ہو۔“
 اگر ہم اس دور زندگی کی تمام تنقیدات کو نظر انداز کر کے صرف متذکرہ بالا جیسے
 کو حذف کر دینے پر ہی غور کریں تو اس سے مصنف کے جذبات و رجحانات کا ہی
 نہیں بلکہ دیانت کا بھی کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ مولانا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی

مصنف کا بہت زیادہ رجحان یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت میں کسی نہ کسی طرح سیاسی
 اجمیت پیدا کی جائے چناں چہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

”اس زمانے میں بین اسلام ازم کا ہوتا سارے یورپ پر بھایا ہوا
 تھا، سفر روم سے واپسی کے بعد مولانا شیخ کے متعلق بھی یہ بدگمانی پھیلی
 کہ وہ بین اسلام ازم کے داعی اور سلطان کے سفیر بن کر ہندوستان آئے ہیں اور کہ
 ان کے سفر نامے نے باوجود ہزار احتیاط کے ٹرکی سے مربوط ہونے کی ایک نئی زنجیر پکڑ دی“
 افسوس ہے کہ قابل مصنف نے حج اصداد کر دیا بین اسلام ازم اور سفارت سلطان دونوں ایک
 دوسرے کی ضد ہیں بین اسلام ازم کے داعی سید جمال الدین افغانی تھے اور سلطان محمد غلامان کا انہیں پناہ دینا تھا۔

”شیخ (یعنی جمال الدین افغانی) اسلامی دنیا کو یورپ کے دست برد سے
 محفوظ رکھنے کے لیے اتحاد اسلامی کی ایک شہر بنیاد تعمیر کرنا چاہتے تھے ان کی
 تحریک دفاعی تھی مگر عبدالحمید محض اپنے تخت و تاج کو دہل کے ہاتھ سے
 محفوظ رکھنے کے لیے یہ سیاسی چال چلنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو
 ڈرا دھمکا سکیں اور بحیثیت خلیفہ کے دنیا کے اسلام میں اپنا وقار قائم کر کے
 اپنی مطلقیت کو قوی کر لیں..... شیخ سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک کے تحفظ

سکا کوئی ذریعہ مولائے اتحاد اسلامی کے نہیں اور عبدالحمید سمجھتے تھے کہ آل عثمان کے تخت پر ان کی ذات خطرے میں رہے گی جب تک کہ تمام اسلامی ممالک ان کو خلیفہ اسلام نہ مان لیں۔ (آثار جمال الدین افغانی ۲۷۶ و ۲۷۷) اب بدگمانی کے ثبوت میں مولانا کی واپسی کے بعد کا ایک قصہ شروع ہوتا ہو۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی زمانے میں کالج میں کوئی جلسہ تھا مولانا نے اردو کا ایک وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا

بزم احباب ہو پُرجوش ہو جلا کیا
اس میں ایک شعر تھا

نوجوانو یہ حریفوں کو دکھا دینا ہو
اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیا
اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی ان انگریزوں کی طرف اٹھ گئی جو جلسے میں بیٹھ ہوئے تھے سمجھانے والوں نے ان کو سمجھایا کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا اور یہ طالب علموں کو بغاوت کا سبق تھا۔ ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہو گئی..... اسی زمانے میں وہ علی گڑھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد اتر گئے اور وہاں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے بنگلے کے خانساں نے مولانا کا نام سنا تو ملنے آیا مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اُس نے کہا کہ کچھ صاحب لوگ یہاں آئے تھے اور وہ آپ کا نام لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے اسی سے دیکھنے کو جی چاہا۔ (۲۸۰ حیات)

اس روایت پر جو ڈاک بنگلے کے خانساں کے مہول بیان پر مبنی ہو اور جس میں ایسی اہمیت پیدا کی گئی ہو ناظرین ہی تبصرہ فرمائیں تو مناسب ہو ہم صرف قصیدہ اذراٹھلی کا واقعہ پیش کریں گے۔

۸۰۰ء میں پرنسپل کالج کے والد مسٹر جوزف بک علی گڑھ آئے تھے ان کی ہر
 حلقے میں بڑی خاطر مدارات ہوئی، ایک ڈیڑھ سالہ بچہ بھی پڑھا جس کا ترجمہ
 انگریزی میں ان کے بھائی نے کیا تھا وغیرہ کے ابھی ہنگاموں میں مولانا نے اپنے
 والد، یہ قصیدہ مولانا کے کلیات میں نہیں ہے اس لیے لطف سخن اور اس امر کے ثبوت میں کہ
 مولانا دلت طرازی کا ہر موقع تاکتے رہتے تھے نقل کیا جاتا ہو۔

چنیں باشد چو دولت یار و طالع ساز گار آید	کہ جوزف بک یہ بھائی کالج زاں دیا ر آید
بہ ہر سو جلوہ رنگِ مسترت را تماشا کن	کہ جوزف بک بسیر ہند با غولیش و تبار آید
زمیں از عکس رنگِ موکش در جلوہ پیرائی	چناں باشد کہ در صحرای ہند لالہ زار آید
زہے جلوہ اخلاقی حسن صورت و سیرت	کہ رنگیں از نگارش در نظر گل در بہار آید
ایں ہم بر غمیشی بالہ دلم بر غود ہی جوشد	کہ ہم چوں صاحبِ حمد و جہد و ابرو گزار آید
زین مقدمش ترتیب دارم بزم تو اشب	عروسِ آسمان کہ در پیرایش نقش و نگار آید
خوشا ترتیب بزم آرائی این جلسہ رنگیں	کہ حسن اتحاد ہم دگر بروے کار آید
بیک سو میزبان را ہماں در پہلوئے الفت	بیک سو ہماں را میزبان اندر کنار آید
و گوئی خانہ اشب صحنِ اشجار مسترت شد	کہ پیدا از در و دیوار شاخِ برگ بار آید
زفر مقدمش گیرد بنائے کالج اعزاز سے	کہ قصر اعتبار قومِ مازیں اُستوار آید
کنون مرا فسرانِ کالج و اسکول را حاصل	ز تشریفِ قد و مشامد و آثار اندر وقار آید
مسلسل کشتہ نظمِ امواج گہر ماند	کہ ہر بیت ز وصفِ سلکِ در شاہوار آید
معنِ دل سپر رنگیں تر و کینِ مخمّر گفتم	کہ خوابی در سخن حاصل ز لطفِ اختصار آید
ترا اقبال و جاہ و حشمت از ہر سو فرا گیرد	گیجے اندر ہمیں باشد گئے اندر یسار آید

ہمیشہ دشمنانت را بہ ساغرِ نہرِ ناکامی

تا دامِ محرابِ مسترتِ خوشن گوار آید

ہیابن بھی طلبہ کی دعوت کی سٹر جوزف بک، سرسید اور دیگر ممبران اسٹان (انگریز ہندوستانی
بھی مدعو تھے اس دعوت میں بھی ۲۶ شعر کا ایک قصیدہ شائع ہوا بعد میں دوشعر اس
موقع پر قابل ملاحظہ ہیں :

صفحہ عیش کی سطریں ہیں ہلکا دیکھو میز کے گرد یہ مجمع ہو صف آگیا
صف جھٹ لوگ ہیں ادھڑیں وہ سہیا دیکھ لیں بوج پہ کھلتا ہو یہ طغرا گیا
اور ایک شعر یہ تھا کہ

نوجوانو یہ زمانے کو دکھا دینا ہو اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیا
لیکن مصنف حیات شبلی نے ”زمانے“ سے ”حرلیوں“ کا لفظ بدل کر ایک واقعہ کی
بنیاد قائم کر دی ہو، حالانکہ کیا تخیل کردہ دائرہ مصنفین میں لفظ ”زمانہ“ وجود پر
اس قصیدے میں دو جگہ حرلیوں کا لفظ بھی آیا ہو :

تم بھی سن لو گے حرلیو کبھی انشا اللہ قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا گیا
اور حرلیو تھیں خان کی قسم سچ کہنا شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا
لیکن اس لفظ حرلیوں کو کبھی قابل اعتراض تصور نہیں کیا گیا اور ۱۸۹۷ء میں پنی ریڈنگ
کے شہزادہ جلسہ نمائش میں جس میں کہ انگریز پروفیسر اور حکام ضلع بھی موجود تھے پھر ایک
طالب علم نے یہی اشعار سنائے، کس قدر حیرت پر کہ ۱۸۸۸ء میں انگلی اٹھنے سے انگریزوں
میں تو بات عام ہو جاتی ہو حتیٰ کہ ایک ڈاک بنگلے کے خانہ ماں تک پہنچتی ہو کہ سرسید مسٹر
بک پرنسپل وغیرہ تک پہنچتی اور چھو سات سال بعد وہ ہی اشعار پھر پڑھے جاتے ہیں
جس میں انگریز بھی تھے۔

مولانا کی سیاسی اہمیت میں قوت پہنچانے کے لیے اب ایک اور بیان ملاحظہ ہو
”کالج میں مولانا کی رائے کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھی وہ شخصی
سلطنت کہ مضر سمجھتے تھے اور جمہوریت کے حامی تھے اس عرصہ میں کانگریس

کا غلغلہ اٹھا تو وہ اس تحریک کے متاعوں میں نکلے ابھی یہ آواز دہنے نہیں
پائی تھی کہ ۱۸۹۶ء کے اخیر میں ندوۃ العلماء کی آواز اٹھی اور اس زور سے
اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی،
مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے ان سب باتوں
نے مل لاکر ان کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصا سالہ اکٹھا کر دیا۔

اس بیان سے پہلے تک کالج کی مدت ملازمت میں صرف ایک مرتبہ داخل
۱۸۹۶ء میں مولانا کی سیاسی رائے کے اظہار کا بیان تھا اب "کئی دفعہ" تازہ اختراع
ہو پھر اس عرصے میں کانگریس کا غلغلہ نہیں اٹھا بلکہ آٹھ سال قبل ۱۸۸۸ء میں اٹھ چکا تھا
اور مولانا کی مرحمت طرازی اس کے ۲۸ سال بعد ۱۸۹۶ء میں شروع ہوئی ہو اس
وقیان میں پبلک طور پر تو کجا ان کے پرائیوٹ خطوط میں بھی اس کا اشارہ نہیں۔

ندوہ کی آواز کا زور بھی مصنف کا اختراع ہو ۱۸۹۶ء میں یہ تحریک اٹھی ۱۸۹۶ء
میں علی گڑھ کالج اور کانفرنس نے زبردست تائید کی۔ کالج سے (ناظم دینیات) مولوی
عبداللہ انصاری بھی شریک ہوئے تھے۔ عرصے تک حکومت کے نزدیک بھی ندوہ
ایک خاص مذہبی و علمی تحریک تھی تا آن کہ خود بقول مصنف ندوہ کی تحریک کے اوج
کے زمانے میں صرف منشی محمد اطہر علی - شہر وکیل کو شکست دینے کے لیے چودھری
نصرت علی (سندیلہ) نے موہنہ متھہ کے فٹنٹ گورنر میکڈانلڈ کو بدگمان بنایا،
مصنف نے اس بدگمانی کا زمانہ بھی ۱۸۹۶ء و ۱۸۹۷ء متعین کیا، ہو اور یہ بھی تسلیم
ہو کہ ۱۸۹۶ء میں مطاع صاف ہو گیا اور مولانا حیدر آباد میں ناظم محکمہ علوم و فنون ہوئے
اور وہاں سے واپس آکر سرکاری کمیٹیوں میں سرکاری طور پر منتخب ہوتے رہے،
لہذا بدگمانیوں کا کوئی سوال ہی نہیں آتا۔

حیاتِ شبلی کے ۲۸۱ تا ۲۹۶ صفحات
سرسید سے کش مکش اور اختلاف | میں یہ عجیب و غریب داستان سے

جس کو مصنف کی حقیقت نگاری، دقیقہ سنجی اور معنی آفرینی کا شام کار سمجھنا چاہیے
 تخلیق واقعات اور قیاسات و ظنیات سے جس طرح مصنف نے کام لیا ہو وہ واقعی
 ایسے ہی محقق و نقاد کا کام ہو، کھتے ہیں کہ

”اب جیسے جیسے دن گزر رہا ہو سرسید اور شبلی میں وہ انگلاسا ارتباط اور پہلا سا
 اعتراف نہیں رہا ہو اور اب وہ موقع آ رہا ہو کہ ان کو سرسید کے حلقے
 سے باہر آ جانا پڑے اس اختلافِ حال اور کش مکش کے اسباب کو حیاتِ
 جاوید میں جگہ نہ پاسکے مگر تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے ضرورت
 ہو کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہو ان اسباب پہ ایک نظر ڈال لی جائے
 اور گو مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی مگر ان کی تحریروں کے پردہ سے
 اب بھی روشنی چھن چھن کر نکل رہی ہو اگر ہم ان شعاہوں کو یک جا کر لیں
 تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پڑنے لگے گی، سرسید میں ساری خیریتوں
 کے ساتھ ایک بڑی کم زوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے آسنا و صدقنا
 کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔“

اس تہمید کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں ٹرسٹیز بل اور سید محمود کی جان شبلی وغیرہ
 کے اختلافات کو بہ اندازِ خاص بیان کیا ہو مگر اس بات کا اشارہ تک نہیں کہ مولانا
 شبلی ان اختلافات میں کس طرف اور کس کے مؤید تھے ان واقعات میں ان کی
 زندگی کا تعلق کسی ایک کی تائید و اختلاف سے ہی ہو سکتا ہو مصنف نے یہ بات
 قصداً چھپائی ہو گی کہ مولانا کی تائید سے وہ بے خبر نہ تھے انہوں نے اسی اختلاف
 میں سید محمود کی شادی کی تقریب پر ایک تہنیتی قسیدہ لکھا تھا جس کے تین

شعریہ ہیں:-

باب کی طرح اب تو م کا بن پشت و پناہ
جانشینی کے لیے کون ہر تجھ سے افضل
ایک عالم کو مسلم ہو تر افضل و کمال
پھر نہ مانے کوئی حاسد تو جنوں کا جو غفل
قوم کی چارہ نوازی بھی ہر تجھ پہ لازم
تجھ کو خالق نے بنایا ہو جو مسعود و ازل
یہ تصدیہ کلیات اُردو شائع کردہ دار المصنفین میں موجود ہر اسی طرح جب لوی
صحیح اللہ خاں نے الہ آباد میں ایک مسلم ہاسٹل بنایا تو مولانا نے اس کی تاریخ
”مسجد ضرار“ لکالی۔

اب دیکھیے کہ سرسید کی کم زوری (آمریت) مولانا کی نظر میں کیا تھی اور وہ اس
بے تنافر رکھتے تھے یا پسند کرتے تھے اپنے حبیب لبیب موثق حیات مشیر دانی کو
کہتے ہیں کہ ”ندوہ میں میگروں امور بے ضابطہ ہوتے رہتے ہیں اس کی تو کچھ نہیں جڑ
نہیں لیکن نصاب کے متعلق آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہو کہ ایک ایک حرف
پر جب تک سب کا اتفاق نہ ہو لے کچھ کیا نہیں جاسکتا۔ مگر میری اس طرح کام نہیں
چلتا۔ سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا۔ (مکاتیب شبلی ۵۷ صفحہ ۱۵۱)
ہمید کے بعد مصنف نے اختلافی شعاعوں کو سلسلے وار دکھایا ہوا اور ہم بھی
سلسلے وار ہی تبصرہ کرتے ہیں۔

پہلی شعاع ”سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف
گزشتہ تعلیم میں کی رسالے کے بیچ میں تراجم کا بیان ختم کر کے ایک
ریسارک کے نیچے لکھا تھا جس کا ماحصل یہ ہو کہ عربوں نے عربی زبان میں نیا
کے علوم کا ترجمہ کر کے اپنے زمانے میں جو ترقی کی اس قیاس پر آج عمل نہیں
کیا جاسکتا۔ سائنٹی فک سوسائٹی کے بانیوں کو عربی کے اس واقعے سے دھوکا
ہوا اور وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ترجموں کے ذریعے سے

علوم کو ترقی دی ہر بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور قوم کو ترقی دیں گے یہ خیال غلط تھا کیوں کہ ان ترجموں کے لیے لاکھوں روپیہ درکار ہیں جو خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ممکن تھا اور اب غیر ممکن ہو دوسرے یہ کہ اس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رکھ چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئی تھیں یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا تھا اور اس زمانے میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہو اور نہ کتابوں کے شمار کی حد تیسری بات یہ کہ اس زمانے میں عربی اسلامی ملکوں میں حکم ناں زبان تھی اور اُدھ حکم ناں زبان نہیں اور دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ قوم نے اس زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی ہو جو ان پر تسلط کرنے والی نہ ہو آخر میں تھا، مگر ہم کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ خود میدان احمد خاں صاحب نے جو سائنسی خاک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد و تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا جو، مستحکم ہوتا ہو کہ یہ ملک اس اعتبار سے بھی، جس کی معذرت بھی کر دی گئی تھی، سرسید کو پسہ نہیں آیا تھا کیوں کہ مولانا حالی نے حیات جاوید میں اس سرسری بات کے جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی اور حاشیے کا ایک پورا صفحہ اُس کے لیے نذر کیا اور بتایا کہ یہ خیال خود سرسید کی تحریروں سے ماخوذ ہو مولانا شبلی کا آپ پیدا کیا ہوا نہیں۔“

مصنف نے ہتھید میں کش کش و اختلاف کے آغاز کا کوئی زمانہ معین نہیں کیا لیکن پہلی شاع سے خود بہ خود معین ہو جاتا ہو یعنی مولانا کے کالج میں آنے کے پارساں بعد ۱۸۵۷ء سے۔ بہر حال سرسید کی ناپسندیدگی اور حیات جاوید کا جواب دونوں کو اس طرح مڑا دیا گیا ہو کہ گویا سرسید نے اپنی لائف میں یہ جواب لکھ دیا ہو سالانہ مولانا شبلی کا وہ سال جس میں یہ ملک اس اعتبار سے مستحکم ہوا، یہ ملک گویا اندر خود سرسید نے

کے خیالات کو متاثر کیا، اگرچہ کوئی ثبوت سرسید یا خود مولانا شبلی کی تحریروں میں یا کوئی مستند زبانی روایت بھی ایسی نہیں کہ شبلی سرسید کے لیے معلوماتِ مثبتہ فراہم کرتے تھے اور انھوں نے حکما و متکلمین اسلام کے خیالات و تصانیف سے سرسید کو آشنا کیا، جن سے سرسید بے خبر تھے، یہ امر تو مسلم ہو کہ علی گڑھ آنے سے پہلے مولانا شبلی مقلدی غیر مقلدی کے دائرے میں چکر لگاتے رہے اور مسلمانوں میں انتشار پھیلانے اور جو انتشار تھا اس کو بڑھانے میں مصروف رہے تھے اور جن تصنیفات و خیالات سے بقول مصنف انھوں نے سرسید کو باخبر کیا ان سے وہ علی گڑھ آکر اور سرسید کی ہی صحبت میں آشنا ہوئے تھے۔ سرسید کی تو متعدد تصانیف اسی رنگ میں مولانا کے علی گڑھ آنے سے پہلے شائع ہو چکی تھیں۔

پھر اس بیان کے بعد لکھتے ہیں کہ

”اسی تصادم سے بچنے کے لیے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لیے تقاضہ کرتے تو ٹال جاتے، بہت مجبور کیا تو ”المعتزلہ والاعتزال“ کے نام سے ایک تاریخی مضمون شائع کیا جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ جولائی ۱۸۹۶ء کے پرچے میں چھپا اور اس کو بھی ناتمام چھوڑ دیا جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۱۲ شوال ۱۳۱۳ھ کے پرچے میں ”مشاہیر معتزلہ“ کے عنوان سے جس طرح ان سے بنا پورا کیا، اس مضمون میں بھی مولانا نے اپنے چھپانے کا اتنا ہتہام کیا کہ صاف صاف اپنا نام شبلی نعمانی لکھنے کے بجائے شبلی کی جگہ ”اللا سوری“ اور ”نعمانی کی جگہ“ الاعظمیٰ لکھا۔“

لیکن اختلاف عقائد کا لازمی نتیجہ تو تصادم نہ تھا، سرسید کے عزیز ترین دوست

سید تفریق مولانا بہ موقع دعوتِ خطاب۔

خصوصاً سید مہدی علی (محسن الملک) عقائد میں ان کے زبردست مخالف تھے اور تہذیب الاخلاق میں ہی اختلاف کرتے رہتے تھے مگر کبھی تصادم نہ ہوا۔ مصنف نے مولانا کی حریت خیال کا تو بڑا ادعا کیا ہو اور خود مولانا نے بھی مذہبی مسائل میں سرسید سے اختلاف کیا..... دعویٰ کیا ہو تو محض تصادم سے بچنے کے لیے عقائد پر کچھ بکھنا ایک بھل بات اور دل کی کم زوری کا ثبوت ہو اور پھر یہ بھی کوئی دھکش کش نہیں ہو سکتی، بلکہ کش کش (بشرطے کہ ہوا) دور ہونے کی وجہ ہو سکتی ہو، واقعہ یہ ہو کہ سرسید کی وفات کے بعد بھی عرصے تک مولانا کی فہرست تصانیف میں عقائد پر کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔

اب تہذیب الاخلاق کا مضمون دیکھیے تو مولانا شبلی اس رسالے میں کسی مضمون کے لکھنے سے ہی انکاری ہیں "میں نے تہذیب الاخلاق کے لیے حاشا کوئی مضمون نہیں لکھا" (مکاتیب موسومہ ابوالکلام ص ۶۷)

تہذیب الاخلاق کے مضامین کے لیے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو لوگ ٹٹی کے اوجھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلکس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے ان کا کوئی مضمون اس میں درج نہ ہوگا (حیات جاوید صفحہ ۳۵) ان دونوں بیانون سے یہ بات صاف ہو جاتی ہو کہ مضمون متذکرہ مولانا شبلی کا نہ تھا اور غور کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہو کہ یہ مضمون مولوی وحید الدین سلیم کا تھا مولانا شبلی اور وہ دونوں سریف تھے ان میں چشمک تھی اور بقول مصنف "علی گڑھ کے زمانے میں ان کے اور مولانا کے درمیان بعض معاملات میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا (۶۱۰ حیات) لہذا مولوی سلیم نے مولانا شبلی کو چڑانے کے لیے اپنا نام (الاسدی الاعظمی) قرار دیا جو شبلی نعمانی کی نسبت سے شان دار ہو اور اسی نام سے وہ مضمون شائع کرایا مضمون کے آخر کا فقرہ یہ ہو کہ مذہب اعتراف کی ابتدا ترقی اور منزل کا یہ نہایت اجمالی خاکہ ہو دوسرے آرٹیکل میں ہم ان فرقوں

کی تفصیل اور ہر ایک عقیدے اور عقائد پر ریویو لکھیں گے تیسرے اسٹریکل میں مشہور سائے
اغترال کے مختصر حالات ہوں گے، معلوم ہوتا ہے کہ چھ مضمون کے بعد ان کو تنبیہ
ہو کہ فرضی نام اختیار نہیں کیا جاسکتا تو انھوں نے جب دوسرا نمبر چھوڑ کر کہ تیسرا نمبر
مشاہیر معتزلہ کے عنوان سے یکم ربیع الاول اور یکم رجب کی اشاعتوں میں لکھا تو اپنا
اصلی نام وحید الدین پانی پتی استعمال کیا۔

مصنف حیاتِ شبلی کی یہ تم ظریفی بھی قابلِ داد ہے کہ باوجود مولانا کا انکار محض
سامنے ہونے کے اس مضمون کو ان کے مقالات جلد پنجم (سوانح) میں شامل کر دیا جالوں
اس مابہ الجث مضمون کو سوانح سے تعلق بھی نہیں۔

یہ امر بھی مبہم رہا کہ مولانا کا تہذیبِ الاخلاق کے لیے مضمون لکھنے کو ملانا
احساس کم تری تھا یا احساس برتری۔ اس دور کے مشہور مضمون نگار سر سید مولوی
نذیر احمد محسن المکاتب مولانا حالی مولوی چارغ علی سید کرامت حسین مولوی
عنایت رسول چٹاپا کوئی وغیرہ جیسے ذی کمال اور اہل علم تھے۔

تیسری شعاع دیکھیے؟ سر سید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے اور
اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پہ پڑتی تھی مولانا سے جب اس کا
ذکر آیا تو انھوں نے اپنی معروف فتووں کا پتہ رکھا، اس کے بعد مولانا کے
ہاموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی جو اس زمانے
عرب کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنہوں نے سر سید کے حکم سے
طبقات ابن سیر کے ایک جیسے کا فارسی ترجمہ کیا تھا مگر مولانا حمید الدین
صاحب نے یہ کیا اور جب سر سید نے باہر اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا
کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا نہیں
چاہتے مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا مگر

سرستید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا۔

مصنف نے اس روایت کا کوئی ماخذ نہیں بتایا نہ زمانے کا تعین کیا نہ اس سے قبل کوئی بدگمانی بتائی گئی جس میں اب اضافہ ہونا بیان کیا ہو، مولانا حمید الدین سہروردیؒ تک ایک طالب علم تھے انھوں نے طبقات ابن سعد کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو چند وزنی رسائل تھے، مگر اب تک انھوں نے اردو یا فارسی سے عربی میں ترجمے کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا تھا جس سے وہ ترجمہ تفسیر کے اہل سمجھے جاتے اور ظاہر ہو کہ جب تک کسی کو عربی زبان پر قدرت و بہارت نہ ہو جو تفسیر کے لیے ضروری ہو اس سے یہ کام نہیں لیا جاسکتا، پھر ایک طالب علم کو اتنا اہم کام دینا جس میں پڑے وقت کی ضرورت تھی کیوں کر ممکن تھا، سرستید کی اگر یہ خواہش ہوتی تو وہ ان دونوں کام نہ نہتے بلکہ اور انتظام بھی کر سکتے تھے انھوں نے خطبات احمدیہ کا اردو سے انگریزی میں اور گبن کی رومن امپائر کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہزاروں رپے صرف کر کے کرایا ہی تھا، اور یہ تو طفلانہ بات ہو کہ کسی نوجوان کی گستاخی سے اُس کے کسی رشتے دار سے کوئی بدگمانی کی جائے۔

چوتھی شعاع عجیب و غریب ہو ”سرستید دعاؤں کی قبولیت کے قائل تھے اور اس لیے قبولیت کے لیے دعا مانگنے کو فعل عبث قرار دیتے تھے اس مسئلے پر تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین اور ان کے اور نواب محسن الملک کے سوال و جواب چھپ رہے تھے اسی زمانے میں علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے انھوں نے سرستید کے مضمون الدعا والاشجاعت کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شائع کیا جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ردیو لکھا اور اس ردیو کے سلسلے میں اس پر افسوس کیا کہ سرستید

جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں بلکہ خانوادہ رسالہ کے جہنم و چراغ ہیں وہ تو دعا کو جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہی غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہو اس کی حمایت کو کھڑا ہو اس رسالے کی قریب استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں اور اس شبہ کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ عظیم گڑھ میں لکھا گیا جو مولانا کا وطن تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقف کار اور شناسا بھی تھے۔

یہ شجاع مولوی اقبال احمد پھیل ایم اے علیگ کی ایک تقریر منہ بجا اصلاح سر لائے میر (اعظم گڑھ) سے خفیہ ہی مگر نہ تو اس ہندو ہڈ رنگ کا اور نہ ان کے مصنفہ رسالے کا نہ سنہ تحریر کا نہ وقار الملک کے ریویو کا کوئی پتہ نشان کہیں ملتا ہو ریویو کا خلاصہ بھی وقار الملک کے اسلوب و انداز تحریر سے متاثر ہو، پھر اگر اس واقعے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بعض لوگوں کو شبہ ہوا اسے سرسید سے کش کش اختلاف کا سبب کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہو البتہ ایک شخص جو مولانا شبلی کے طرز عمل سے واقف ہو کہ وہ اپنے رسائل و مضامین وغیرہ دوسروں کے نام سے شائع کراتے رہتے تھے تو وہ اس کو قبول کرے گا کہ یہ دل نشین رسالہ بھی انھیں کا لکھا ہوا تھا اور یہ جرأت اخلاق کا فقدان تھا کہ خود میدان میں نہ آئیں۔ مصنف حیات شبلی ہی کی روایت کے مطابق وہ ”شبلی نعمانی“ کی جگہ ”الاسدی الاعظمی“ بن گئے تھے نیز نہ وہ کے ققیوں اور اہلال (اخبار) میں کثافت ووصاف کی نعموں میں بھی نام بدل لیتے تھے۔

پانچویں شعاع میں لکھتے ہیں کہ ان واقعات کے ساتھ الفادوی کی تصنیف سے جو اختلاف برپا ہوا تھا وہ بھی شمار کے لائق ہو۔ اس بحث کو گزشتہ صفحات ۳۲ تا

۳۷ سرسید نے دعا کو غیر ضروری اور فضول نہیں بتایا بلکہ فرض میں لکھا ہو۔ (محکاتبات الحقائق)

۱۲۶ میں پورے سوز پر کیا گیا ہو اور یہاں چند جملوں میں ختم کر دیا ہو "الفاروق، پوری محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض و اختلاف اور ناراضی کی کوئی پروا نہ کی" اعتراض اختلاف تو خیر ایک حد تک صحیح ہو لیکن یہ "ناراضی" کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہو۔ جس کی تفصیل پیچھے آچکی۔

چھٹی شعاع یہ ہو کہ "مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت و بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی یہ ہو کہ مولانا نے مذہب کے کسی طبقے میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی ہو کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہو کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں" سرسید کو ان کی تقریر پر بڑا غصہ آیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستے سے پیچھے ہٹا دیں گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں چنانچہ اس کے خلاف انہوں نے سخت مضمون لکھا : (۲۹۰)

مصنف نے مسلمانوں کے انگریز ہو جانے کے متعلق حاشیے میں لکھا ہو کہ "یہ تصریح سرسید کی تحریروں میں ہو" لیکن کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ مل بھی نہیں سکتا کیوں کہ اس کا وجود ہی نہیں، برخلاف اس کے سرسید تو ان مراسم کو بھی ضروری جانتے تھے جن میں مذہب کی زرا بھی جھلک ہو جیسے بسم اللہ کی تقریب کہ وہ ذمہ دار ہو اور نہ مستحب چنانچہ انہوں نے اپنے پوتے (سرسید واس مسود مرحوم) کی تقریب بسم اللہ کے موقع پر ایسے مراسم کی اہمیت پر جو تقریر کی ہو وہ ان کے مجاہد

میں موجود ہو۔ مسلمانوں کا یورپین عورتوں سے شادی کرنا جو مذہباً ناجائز نہیں سرسید کے نزدیک اتنا بڑا تھا کہ جب چند ایسی مثالیں سامنے آئیں تو کانفرنس میں ایک سخت رد و لیونشن پیش کیا۔ پردہ شرعی و رسمی اُس زمانے میں بھی ایک اہم موضوع تھا اور سرسید نہ صرف شرعی پردے کے بلکہ رسمی پردے کے بھی زبردست حامی تھے۔ انگریزوں سے اتنے میل جول کے باوجود سرسید کے زنان خانے میں اس میل جول کی ہوا تک نہ پہنچی تھی حتیٰ کہ سرسید کو عورتوں میں تعلیم جدید کی اشاعت بھی گوارا نہ تھی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ”سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلباء میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہو کہ وہ انگریزی طور و طریق اور وضع قطع اختیار کریں تاکہ ان میں حاکمانہ رُوح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اُتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا دوسرا نقصان یہ تھا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی قوم سے دُور سے دُور تر ہوتے گئے تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور و طریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سرو سامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی وہ اس نقالی کی بدولت تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد و اعانت کے قابل نہ رہے اور نہ وہ ایتار کی کوئی خدمت انجام دے سکے مولانا شبلی مرحوم سرسید کے اس خیال کے تمام تر مخالف تھے“

مصنف نے خود ہی ایک خیال پیدا اور قائم کر کے ریاکارک کر لیا اور آخری فقرے میں مولانا کی مخالفت اضافہ کر دی لیکن حقائق و واقعات کو پس پشت ڈال دیا، سرسید کو اپنی قوم کے نوجوانوں کی جیسی تربیت مقصود تھی اس کو انھوں نے

سرسید نے اس سیکلے پردہ مضمون بھی لکھے ہیں۔

مستعد و تفریموں اور تحریروں میں بیان کیا ہو جو نہ صفحات کا غڈ سے محو ہوئیں اور نہ اس کے
آخر و علامت ناہید ہوئے، انھوں نے وقتاً فوقتاً جو تقریریں کی ہیں ان کا جزوی اقتباس
قابل مطالعہ ہو۔

(۱) اگر تم آسمان کے تار سے ہوجاؤ اور ہماری قوم میں نہ رہو تو جو تعلق یا رشتہ
میں نے جوڑا، تو وہ بالکل ٹوٹ جاتا ہو (۳۹۰ مجموعہ ۲۰) سب سے اول ہمارا
مقصد یہ ہو کہ مسلمانوں میں نیشنلسٹی یعنی قومیت اور قومی اتحاد اور قومی ہمبستگی
جو اول سیرتھی قومی ترقی کی اہم قائم رہے اس کے لیے مقدم یہ کرنا ہو کہ وہ
مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اور اس
لیے ضرور ہو کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں..... پھر ہم
کو اپنی قومیت قائم رکھنے کے لیے عربی زبان کی بھی جو ہمارے بزرگوں اور
پاک مذہب کی زبان ہو، جس قدر ہو سکے تعلیم دینا ہو کم سے کم یہ کہ فارسی
زبان ہی سکھا دیں تاکہ قومیت کا اثر ان میں پایا جائے انگریزی تعلیم کے سبب
سے ان میں سے قومیت معدوم نہ ہونے پائے (۱۳۵، مجموعہ ۲) جو مسلمان
نوجوان کالج میں رکھے جائیں وہ عمدہ اگر عمدہ نہ ہو تو متوسط حالت میں رکھے
جائیں ان کے رہنے کے مکانات صاف اور درست ہوں ان کو پاکیزہ اور
صاف لباس پہننے کی عادت ڈالی جائے، سلیقے سے رہنا اپنے مکان کو
درست رکھنا ان پر لازم کیا جائے سب کو اگر ممکن ہو ایک سی حالت میں
رہنے کی تدبیر کی جائے کھانے کا انتظام ایسی طرح پر ہو کہ جس سے ان کو
کھانے کا آپس میں دوستانہ اور بادرانہ طریقے سے مل کر کھانا آجائے
جو ایک بڑی تدبیر قومی موانست اور قومی یکجہانگی کی ہو بعض لوگوں کی
راے اس کے برخلاف ہو کہ کہتے ہیں کہ ایسی ہندو عادتیں طالب علموں

میں نہ ڈولی جائیں کیوں کہ جب وہ کالج سے نکلیں گے تو ان کی قیمت میں ایک
 قلی کے طوڑ پر پہناؤ وہ ایسی اچھی طرح کیوں کر مہ نگیں گے وہ لوگ ان تمام
 تدبیروں سے جو ان نوجوان مسلمانوں کو ہندو بنانے کے طریق سے رہنے کی سکھائی جائیں
 اس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ مزید مفلس آدمیوں کو جس طرح کہ مسجد
 یا غیرت خانوں میں یا خیراتی اسکولوں میں رہتے ہیں یا جس طرح مددِ عالمیہ
 جامعہ ازہر مصر میں طالب علموں کو ایک گلی میں کھڑا کر کے ان کے ہاتھوں میں
 دو دو یا تین تین خیراتی روٹیاں رکھ دی جاتی ہیں اسی طرح یا اس کے مثل
 سسٹنٹ یا آسان طریقہ انرا جاتِ تعلیم کا اختیار کیا جائے تاکہ کثرت سے غریب
 آدمی بھی تعلیم پا جائیں، اے دوستو! اگر اس طریقے سے قوم قوم بن سکتی ہو
 اگر اس طریقے سے مسلمان بچوں میں آدمیت، غیرت، سیلف ریسپکٹ پیدا
 ہو سکتی ہو اگر تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تمہارے بچے اس طرح تعلیم پائیں
 اور تعلیم کے ساتھ ذات کی زندگی وہ کما لے جائیں تو بہتر، مگر میری رائے
 میں تو اس طریق سے کوئی قوم مغز نہ قوم نہیں بن سکتی جو لوگ اس طرح تعلیم
 دینا چاہتے ہیں ان کو مناسب ہو کہ خیراتی اسکول و کالج کھولیں مگر یہ نہیں
 ہو سکتا کہ جو بچے قوم کے قوم بننے کے لائق ہیں ان کو بھی ان کے ساتھ ملا کر
 جن سے کچھ توقع نہیں ہو برباد کر دیا جائے۔“ (۲۵ مجلہ ۵)۔ (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰) (۱۰۱) (۱۰۲) (۱۰۳) (۱۰۴) (۱۰۵) (۱۰۶) (۱۰۷) (۱۰۸) (۱۰۹) (۱۱۰) (۱۱۱) (۱۱۲) (۱۱۳) (۱۱۴) (۱۱۵) (۱۱۶) (۱۱۷) (۱۱۸) (۱۱۹) (۱۲۰) (۱۲۱) (۱۲۲) (۱۲۳) (۱۲۴) (۱۲۵) (۱۲۶) (۱۲۷) (۱۲۸) (۱۲۹) (۱۳۰) (۱۳۱) (۱۳۲) (۱۳۳) (۱۳۴) (۱۳۵) (۱۳۶) (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۳۹) (۱۴۰) (۱۴۱) (۱۴۲) (۱۴۳) (۱۴۴) (۱۴۵) (۱۴۶) (۱۴۷) (۱۴۸) (۱۴۹) (۱۵۰) (۱۵۱) (۱۵۲) (۱۵۳) (۱۵۴) (۱۵۵) (۱۵۶) (۱۵۷) (۱۵۸) (۱۵۹) (۱۶۰) (۱۶۱) (۱۶۲) (۱۶۳) (۱۶۴) (۱۶۵) (۱۶۶) (۱۶۷) (۱۶۸) (۱۶۹) (۱۷۰) (۱۷۱) (۱۷۲) (۱۷۳) (۱۷۴) (۱۷۵) (۱۷۶) (۱۷۷) (۱۷۸) (۱۷۹) (۱۸۰) (۱۸۱) (۱۸۲) (۱۸۳) (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰) (۲۰۱) (۲۰۲) (۲۰۳) (۲۰۴) (۲۰۵) (۲۰۶) (۲۰۷) (۲۰۸) (۲۰۹) (۲۱۰) (۲۱۱) (۲۱۲) (۲۱۳) (۲۱۴) (۲۱۵) (۲۱۶) (۲۱۷) (۲۱۸) (۲۱۹) (۲۲۰) (۲۲۱) (۲۲۲) (۲۲۳) (۲۲۴) (۲۲۵) (۲۲۶) (۲۲۷) (۲۲۸) (۲۲۹) (۲۳۰) (۲۳۱) (۲۳۲) (۲۳۳) (۲۳۴) (۲۳۵) (۲۳۶) (۲۳۷) (۲۳۸) (۲۳۹) (۲۴۰) (۲۴۱) (۲۴۲) (۲۴۳) (۲۴۴) (۲۴۵) (۲۴۶) (۲۴۷) (۲۴۸) (۲۴۹) (۲۵۰) (۲۵۱) (۲۵۲) (۲۵۳) (۲۵۴) (۲۵۵) (۲۵۶) (۲۵۷) (۲۵۸) (۲۵۹) (۲۶۰) (۲۶۱) (۲۶۲) (۲۶۳) (۲۶۴) (۲۶۵) (۲۶۶) (۲۶۷) (۲۶۸) (۲۶۹) (۲۷۰) (۲۷۱) (۲۷۲) (۲۷۳) (۲۷۴) (۲۷۵) (۲۷۶) (۲۷۷) (۲۷۸) (۲۷۹) (۲۸۰) (۲۸۱) (۲۸۲) (۲۸۳) (۲۸۴) (۲۸۵) (۲۸۶) (۲۸۷) (۲۸۸) (۲۸۹) (۲۹۰) (۲۹۱) (۲۹۲) (۲۹۳) (۲۹۴) (۲۹۵) (۲۹۶) (۲۹۷) (۲۹۸) (۲۹۹) (۳۰۰) (۳۰۱) (۳۰۲) (۳۰۳) (۳۰۴) (۳۰۵) (۳۰۶) (۳۰۷) (۳۰۸) (۳۰۹) (۳۱۰) (۳۱۱) (۳۱۲) (۳۱۳) (۳۱۴) (۳۱۵) (۳۱۶) (۳۱۷) (۳۱۸) (۳۱۹) (۳۲۰) (۳۲۱) (۳۲۲) (۳۲۳) (۳۲۴) (۳۲۵) (۳۲۶) (۳۲۷) (۳۲۸) (۳۲۹) (۳۳۰) (۳۳۱) (۳۳۲) (۳۳۳) (۳۳۴) (۳۳۵) (۳۳۶) (۳۳۷) (۳۳۸) (۳۳۹) (۳۴۰) (۳۴۱) (۳۴۲) (۳۴۳) (۳۴۴) (۳۴۵) (۳۴۶) (۳۴۷) (۳۴۸) (۳۴۹) (۳۵۰) (۳۵۱) (۳۵۲) (۳۵۳) (۳۵۴) (۳۵۵) (۳۵۶) (۳۵۷) (۳۵۸) (۳۵۹) (۳۶۰) (۳۶۱) (۳۶۲) (۳۶۳) (۳۶۴) (۳۶۵) (۳۶۶) (۳۶۷) (۳۶۸) (۳۶۹) (۳۷۰) (۳۷۱) (۳۷۲) (۳۷۳) (۳۷۴) (۳۷۵) (۳۷۶) (۳۷۷) (۳۷۸) (۳۷۹) (۳۸۰) (۳۸۱) (۳۸۲) (۳۸۳) (۳۸۴) (۳۸۵) (۳۸۶) (۳۸۷) (۳۸۸) (۳۸۹) (۳۹۰) (۳۹۱) (۳۹۲) (۳۹۳) (۳۹۴) (۳۹۵) (۳۹۶) (۳۹۷) (۳۹۸) (۳۹۹) (۴۰۰) (۴۰۱) (۴۰۲) (۴۰۳) (۴۰۴) (۴۰۵) (۴۰۶) (۴۰۷) (۴۰۸) (۴۰۹) (۴۱۰) (۴۱۱) (۴۱۲) (۴۱۳) (۴۱۴) (۴۱۵) (۴۱۶) (۴۱۷) (۴۱۸) (۴۱۹) (۴۲۰) (۴۲۱) (۴۲۲) (۴۲۳) (۴۲۴) (۴۲۵) (۴۲۶) (۴۲۷) (۴۲۸) (۴۲۹) (۴۳۰) (۴۳۱) (۴۳۲) (۴۳۳) (۴۳۴) (۴۳۵) (۴۳۶) (۴۳۷) (۴۳۸) (۴۳۹) (۴۴۰) (۴۴۱) (۴۴۲) (۴۴۳) (۴۴۴) (۴۴۵) (۴۴۶) (۴۴۷) (۴۴۸) (۴۴۹) (۴۵۰) (۴۵۱) (۴۵۲) (۴۵۳) (۴۵۴) (۴۵۵) (۴۵۶) (۴۵۷) (۴۵۸) (۴۵۹) (۴۶۰) (۴۶۱) (۴۶۲) (۴۶۳) (۴۶۴) (۴۶۵) (۴۶۶) (۴۶۷) (۴۶۸) (۴۶۹) (۴۷۰) (۴۷۱) (۴۷۲) (۴۷۳) (۴۷۴) (۴۷۵) (۴۷۶) (۴۷۷) (۴۷۸) (۴۷۹) (۴۸۰) (۴۸۱) (۴۸۲) (۴۸۳) (۴۸۴) (۴۸۵) (۴۸۶) (۴۸۷) (۴۸۸) (۴۸۹) (۴۹۰) (۴۹۱) (۴۹۲) (۴۹۳) (۴۹۴) (۴۹۵) (۴۹۶) (۴۹۷) (۴۹۸) (۴۹۹) (۵۰۰) (۵۰۱) (۵۰۲) (۵۰۳) (۵۰۴) (۵۰۵) (۵۰۶) (۵۰۷) (۵۰۸) (۵۰۹) (۵۱۰) (۵۱۱) (۵۱۲) (۵۱۳) (۵۱۴) (۵۱۵) (۵۱۶) (۵۱۷) (۵۱۸) (۵۱۹) (۵۲۰) (۵۲۱) (۵۲۲) (۵۲۳) (۵۲۴) (۵۲۵) (۵۲۶) (۵۲۷) (۵۲۸) (۵۲۹) (۵۳۰) (۵۳۱) (۵۳۲) (۵۳۳) (۵۳۴) (۵۳۵) (۵۳۶) (۵۳۷) (۵۳۸) (۵۳۹) (۵۴۰) (۵۴۱) (۵۴۲) (۵۴۳) (۵۴۴) (۵۴۵) (۵۴۶) (۵۴۷) (۵۴۸) (۵۴۹) (۵۵۰) (۵۵۱) (۵۵۲) (۵۵۳) (۵۵۴) (۵۵۵) (۵۵۶) (۵۵۷) (۵۵۸) (۵۵۹) (۵۶۰) (۵۶۱) (۵۶۲) (۵۶۳) (۵۶۴) (۵۶۵) (۵۶۶) (۵۶۷) (۵۶۸) (۵۶۹) (۵۷۰) (۵۷۱) (۵۷۲) (۵۷۳) (۵۷۴) (۵۷۵) (۵۷۶) (۵۷۷) (۵۷۸) (۵۷۹) (۵۸۰) (۵۸۱) (۵۸۲) (۵۸۳) (۵۸۴) (۵۸۵) (۵۸۶) (۵۸۷) (۵۸۸) (۵۸۹) (۵۹۰) (۵۹۱) (۵۹۲) (۵۹۳) (۵۹۴) (۵۹۵) (۵۹۶) (۵۹۷) (۵۹۸) (۵۹۹) (۶۰۰) (۶۰۱) (۶۰۲) (۶۰۳) (۶۰۴) (۶۰۵) (۶۰۶) (۶۰۷) (۶۰۸) (۶۰۹) (۶۱۰) (۶۱۱) (۶۱۲) (۶۱۳) (۶۱۴) (۶۱۵) (۶۱۶) (۶۱۷) (۶۱۸) (۶۱۹) (۶۲۰) (۶۲۱) (۶۲۲) (۶۲۳) (۶۲۴) (۶۲۵) (۶۲۶) (۶۲۷) (۶۲۸) (۶۲۹) (۶۳۰) (۶۳۱) (۶۳۲) (۶۳۳) (۶۳۴) (۶۳۵) (۶۳۶) (۶۳۷) (۶۳۸) (۶۳۹) (۶۴۰) (۶۴۱) (۶۴۲) (۶۴۳) (۶۴۴) (۶۴۵) (۶۴۶) (۶۴۷) (۶۴۸) (۶۴۹) (۶۵۰) (۶۵۱) (۶۵۲) (۶۵۳) (۶۵۴) (۶۵۵) (۶۵۶) (۶۵۷) (۶۵۸) (۶۵۹) (۶۶۰) (۶۶۱) (۶۶۲) (۶۶۳) (۶۶۴) (۶۶۵) (۶۶۶) (۶۶۷) (۶۶۸) (۶۶۹) (۶۷۰) (۶۷۱) (۶۷۲) (۶۷۳) (۶۷۴) (۶۷۵) (۶۷۶) (۶۷۷) (۶۷۸) (۶۷۹) (۶۸۰) (۶۸۱) (۶۸۲) (۶۸۳) (۶۸۴) (۶۸۵) (۶۸۶) (۶۸۷) (۶۸۸) (۶۸۹) (۶۹۰) (۶۹۱) (۶۹۲) (۶۹۳) (۶۹۴) (۶۹۵) (۶۹۶) (۶۹۷) (۶۹۸) (۶۹۹) (۷۰۰) (۷۰۱) (۷۰۲) (۷۰۳) (۷۰۴) (۷۰۵) (۷۰۶) (۷۰۷) (۷۰۸) (۷۰۹) (۷۱۰) (۷۱۱) (۷۱۲) (۷۱۳) (۷۱۴) (۷۱۵) (۷۱۶) (۷۱۷) (۷۱۸) (۷۱۹) (۷۲۰) (۷۲۱) (۷۲۲) (۷۲۳) (۷۲۴) (۷۲۵) (۷۲۶) (۷۲۷) (۷۲۸) (۷۲۹) (۷۳۰) (۷۳۱) (۷۳۲) (۷۳۳) (۷۳۴) (۷۳۵) (۷۳۶) (۷۳۷) (۷۳۸) (۷۳۹) (۷۴۰) (۷۴۱) (۷۴۲) (۷۴۳) (۷۴۴) (۷۴۵) (۷۴۶) (۷۴۷) (۷۴۸) (۷۴۹) (۷۵۰) (۷۵۱) (۷۵۲) (۷۵۳) (۷۵۴) (۷۵۵) (۷۵۶) (۷۵۷) (۷۵۸) (۷۵۹) (۷۶۰) (۷۶۱) (۷۶۲) (۷۶۳) (۷۶۴) (۷۶۵) (۷۶۶) (۷۶۷) (۷۶۸) (۷۶۹) (۷۷۰) (۷۷۱) (۷۷۲) (۷۷۳) (۷۷۴) (۷۷۵) (۷۷۶) (۷۷۷) (۷۷۸) (۷۷۹) (۷۸۰) (۷۸۱) (۷۸۲) (۷۸۳) (۷۸۴) (۷۸۵) (۷۸۶) (۷۸۷) (۷۸۸) (۷۸۹) (۷۹۰) (۷۹۱) (۷۹۲) (۷۹۳) (۷۹۴) (۷۹۵) (۷۹۶) (۷۹۷) (۷۹۸) (۷۹۹) (۸۰۰) (۸۰۱) (۸۰۲) (۸۰۳) (۸۰۴) (۸۰۵) (۸۰۶) (۸۰۷) (۸۰۸) (۸۰۹) (۸۱۰) (۸۱۱) (۸۱۲) (۸۱۳) (۸۱۴) (۸۱۵) (۸۱۶) (۸۱۷) (۸۱۸) (۸۱۹) (۸۲۰) (۸۲۱) (۸۲۲) (۸۲۳) (۸۲۴) (۸۲۵) (۸۲۶) (۸۲۷) (۸۲۸) (۸۲۹) (۸۳۰) (۸۳۱) (۸۳۲) (۸۳۳) (۸۳۴) (۸۳۵) (۸۳۶) (۸۳۷) (۸۳۸) (۸۳۹) (۸۴۰) (۸۴۱) (۸۴۲) (۸۴۳) (۸۴۴) (۸۴۵) (۸۴۶) (۸۴۷) (۸۴۸) (۸۴۹) (۸۵۰) (۸۵۱) (۸۵۲) (۸۵۳) (۸۵۴) (۸۵۵) (۸۵۶) (۸۵۷) (۸۵۸) (۸۵۹) (۸۶۰) (۸۶۱) (۸۶۲) (۸۶۳) (۸۶۴) (۸۶۵) (۸۶۶) (۸۶۷) (۸۶۸) (۸۶۹) (۸۷۰) (۸۷۱) (۸۷۲) (۸۷۳) (۸۷۴) (۸۷۵) (۸۷۶) (۸۷۷) (۸۷۸) (۸۷۹) (۸۸۰) (۸۸۱) (۸۸۲) (۸۸۳) (۸۸۴) (۸۸۵) (۸۸۶) (۸۸۷) (۸۸۸) (۸۸۹) (۸۹۰) (۸۹۱) (۸۹۲) (۸۹۳) (۸۹۴) (۸۹۵) (۸۹۶) (۸۹۷) (۸۹۸) (۸۹۹) (۹۰۰) (۹۰۱) (۹۰۲) (۹۰۳) (۹۰۴) (۹۰۵) (۹۰۶) (۹۰۷) (۹۰۸) (۹۰۹) (۹۱۰) (۹۱۱) (۹۱۲) (۹۱۳) (۹۱۴) (۹۱۵) (۹۱۶) (۹۱۷) (۹۱۸) (۹۱۹) (۹۲۰) (۹۲۱) (۹۲۲) (۹۲۳) (۹۲۴) (۹۲۵) (۹۲۶) (۹۲۷) (۹۲۸) (۹۲۹) (۹۳۰) (۹۳۱) (۹۳۲) (۹۳۳) (۹۳۴) (۹۳۵) (۹۳۶) (۹۳۷) (۹۳۸) (۹۳۹) (۹۴۰) (۹۴۱) (۹۴۲) (۹۴۳) (۹۴۴) (۹۴۵) (۹۴۶) (۹۴۷) (۹۴۸) (۹۴۹) (۹۵۰) (۹۵۱) (۹۵۲) (۹۵۳) (۹۵۴) (۹۵۵) (۹۵۶) (۹۵۷) (۹۵۸) (۹۵۹) (۹۶۰) (۹۶۱) (۹۶۲) (۹۶۳) (۹۶۴) (۹۶۵) (۹۶۶) (۹۶۷) (۹۶۸) (۹۶۹) (۹۷۰) (۹۷۱) (۹۷۲) (۹۷۳) (۹۷۴) (۹۷۵) (۹۷۶) (۹۷۷) (۹۷۸) (۹۷۹) (۹۸۰) (۹۸۱) (۹۸۲) (۹۸۳) (۹۸۴) (۹۸۵) (۹۸۶) (۹۸۷) (۹۸۸) (۹۸۹) (۹۹۰) (۹۹۱) (۹۹۲) (۹۹۳) (۹۹۴) (۹۹۵) (۹۹۶) (۹۹۷) (۹۹۸) (۹۹۹) (۱۰۰۰)

یا مجھ سے زیادہ ہو اور جن لوگوں نے مصر کی سیر کی ہو اور جامع اذہر کے مدرسہ اور طالب علموں کو دیکھا ہو انھوں نے یہ سب باتیں اپنی آنکھ سے دیکھی ہوں گی ہندستان میں اب بھی اسلامی مدرسوں میں اس کا نشان پایا جاتا ہو اس زمانے کے طالب علموں کو پہننے کے لیے ایک کمرہ اور ایک پاجامہ اور زیادہ سے زیادہ تکلف ہوا تو ایک لنگی کافی تھی، میرا مطلب اس بیان سے ان کی تحقیر کرنا نہیں کیوں کہ ان طالب علموں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو نہایت مقدس اور قابلِ ادب ہیں بلکہ میرا مطلب اس بیان سے ایک امر واقعی کا بیان کرنا ہو اور یہ بتانا ہو کہ اب زمانہ بدل گیا ہو اس زمانے میں وہ سادہ اور کم خرچ طریقہ علوم تحصیل کرنے کا نہیں چل سکتا خصوصاً علوم انگریزی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتے، اور نہ وہ اوصاف طالب علموں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کا پیدا ہونا بہ مقتضیات زمانہ ہم ان میں چاہتے ہیں اور نہ اس طریقہ تعلیم و تربیت سے ان میں بہت و جرات اور سیلف رسپیکٹ پیدا ہو سکتی ہو نہ غیرت اور حریمت باقی رہتی ہو نہ ان میں قومی ہم دردی کا جوش پیدا ہوتا ہو نہ قوم کو ان سے قومی بہبودی کی توقع ہو سکتی ہو اُس زمانے میں جو کچھ جلوہ تھا وہ صرف ایسی سلطنت کا تھا جو انھی کی ہم خیال تھی جو مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے یا تعلیم پاتے تھے مگر اس زمانے میں سلطنت کا قوموں کا قوموں کی ترقی و بہبودی کا اور علوم کا اور قوم کے غریبوں کی مدد کرنے کا سب رنگ بدل گیا ہو اور جب تک ہم بھی نہ بدل جائیں اور زمانے کے ساتھ نہ چلیں کسی طرح کام یابی حاصل نہیں کر سکتے۔

اس زمانے میں بھی مسلمان طالب علم اور شریف خاندانوں کے بچے بہت زیادہ امداد کے محتاج ہیں قوم کے سرداروں اور قوم کے مال داؤں

اور قوم کے ترقی خواہوں کو ان کی امداد کرنی ضرور ہو گمراہ اس سے پہلے طریقے سے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا بلکہ دوسرے طریقے سے جس سے ان طلب علم کی حمیت، غیرت، سیلف ریسکٹ میں بھی کچھ خلل نہ آوے اور ان کو تعلیم میں بھی مدد ملے وہ مشرفانہ طریقے پر رکھے جا دیں تاکہ ان کی حمیت اور غیرت اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی خصلت کو روز بہ روز ترقی ہوتی جائے جو آئندہ کو قومی ترقی اور بہبودی کا ذریعہ ہو۔“ (۵۶۸ مجموعہ)

مولانا شبلی اپنے سفر نامے میں جامعہ ازہر کی یہ حالت (جو سرسید نے بیان کی) زیادہ تشریح کے ساتھ لکھی ہو۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”مجھ کو اپنے تمام سفر میں جن قدر جامعہ ازہر کے حالات کے مسلمانوں کی بندختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا..... انوس ہو کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے مسلمانوں کو برباد کر چکا ہو اور کرتا جاتا ہو تربیت معاشرت کا جو طریقہ ہو اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مسندی بلند نظری، جوش ہمت غرض تمام مشرفانہ اوصاف کا استعمال ہو جاتا ہو۔ غرض یہ تربیت تھی جس کو سرسید چاہتے تھے رہا انگریزی طور و طریق اور وضع قطع کا پانا تو یہی مصنف حیات شبلی کا اختراع اور خواہ مخواہ ایک الزام ہو۔ ہر قوم دوسری قوموں کے اختلاط اور سفر و سیاحت سے متاثر ہو کر تمدن و معاشرت میں تبدیلی کرتی رہتی ہو، آغا: اسلام سے ہی یہ اثرات مترتب ہونے شروع ہوئے اور مسلمانوں میں عجمی تکلفات پیدا ہو گئے حالانکہ عجم مفتوح و محکوم تھا اور عرب فاتح و حاکم تھے (یہ تفصیل مولانا شبلی کے ایک مقالے ”غیر قوموں کی مشابہت“ میں پڑھنی چاہیے) اسی طرح ہندستان مسلمان فاتحین اور مسلمان تجار کے تمدن و معاشرت سے متاثر ہوا، ۱۹ ویں صدی کے آغاز سے مغربی تمدن و معاشرت کی جو لہریں اٹھیں وہ ایشیائی اور اسلامی ممالک تک پہنچیں ہندستان میں بھی انگریزوں کے ساتھ یہ اثرات آئے

مگر غریب ۱۸۵۷ء کے بعد تک انگریزوں کا ایک گروہ اپنے نسلی غور اور قومی حکومت کے تہنتر سے ہندوستانیوں کا بوٹ پہننا بھی گوارا نہ کرتا تھا، اس پر کی جھگڑا یہ ہوئے گورنر جنرل کو احکام نافذ کرنا پڑے، بہر حال مردہ زمانہ کے ساتھ مغربی تمدن معاشرت کا ہندستان میں رواج ہوتا چلا گیا پہلے بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً مدراسی، بھارتی، مرہٹہ بنگالی اور پارسی قوموں میں اس کا رواج ہوا سرسید نے بھی ۱۸۵۷ء میں جب کہ وہ عازم انگلستان تھے ترکی لباس جو انگریزی لباس کی متنبہ شکل ہو اختیار کیا اور کچھ عرصے بعد ان کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا ایک قومی لباس ہونا چاہیے۔ کالج میں بھی بعض طلبانے ترکی کوٹ پہننا شروع کر دیا ۱۸۵۹ء میں سرسید نے اپنے اس خیال کو ایک مضمون کی صورت میں انٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا اول انھوں نے ہندستان میں جو لباس مختلف قسم کا ہو اس کو بیان کیا اور پھر لکھا کہ ”ہندستان میں سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کو نیشنلسٹی قائم کرنے کی ہو جس کو ان کے بزرگوں نے ہندستان میں آکر ڈوب دیا ہو ان کو ایک نیشنل لباس اختیار یا اچھا کرنا لازم ہو جو نیشنلسٹی کا نالا کر کے والا ہو..... بلاشبہ ترکوں سے اور ترکوں کی سلطنت سے (گوافسوس ہو کہ ہمیں معلوم اس کی عمر کتنی باقی ہو) ہم مسلمانوں کو فخر اہی تمام ہمارے مقدس معبد مکہ معظمہ مدینہ منورہ بیت المقدس سب ان کے زیر حکومت ہیں (گویہ بات خدا کو معلوم ہو کہ کب تک رہیں گے)۔ اس قوم نے نہایت عمدہ اور ہر موقع کے مناسب اک لباس اختیار کیا ہو جو بہت حالتوں میں موجودہ زمانے کے مناسب اور قریب قریب اس لباس کے جو جو ہم پر حکومت کرنے والی قوم کا لباس ہو صرف لٹپی کا فرق ہو پھر کیا وجہ ہو کہ ہم اس کو اپنا نیشنل لباس قرار نہ دیں ہم کو معلوم ہو کہ بعض انگریز اس لباس سے چڑتے ہیں بلکہ ہم ایسے متعصب انگریزوں سے واقف ہیں جو کہتے تھے کہ ہم جس ہندستانی کی ٹانگوں میں

۱۸۵۷ء انٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی اس غور کے خلاف متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔

پتلون اور بدن میں ٹرکش یا انگلیش کوٹ اور سر پر لال ٹرکش ٹوپی دیکھتے ہیں تو باہری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے یہ مغرور اور مستعصب انگریز ہندوستانیوں کو خلائی کی لباس میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ ہندوستانی ان سے دوستانہ طریقے سے ملیں..... مگر ہم ہندوستانیوں کو ان مستعصب اور مغرور انگریزوں پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ خود ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم کو اپنی قوم کی بہتری کے لیے کیا کرنا لازم ہو۔“

سر سید کا خیال تھا کہ کالج میں ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی کو بہ طور یونی فارم رواج دیا جائے مولانا شبلی نے بھی قسطنطنیہ سے ایک خط میں تائید کی کہ ”یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی ہے کہ کالج کا خاص لباس ہو اور کوٹ پر گرہیں کے قریب ہر کالج کا نام لکھا ہوتا ہو مجھ کو یہ بات بہت پسند ہوئی ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا مستید صاحب قبلہ بغیر کسی پس دیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہو۔“ (خط ۵ جون ۱۸۷۷ء موسومہ شیخ حبیب اللہ)

اگرچہ یہ لباس کالج میں بہ طور یونی فارم لازم نہیں ہوا مگر چند طلباء ترکی کوٹ ترکی ٹوپی اور بوٹ استعمال کرنے تھے بعض انگریزوں کو یہ ناگوار تھا سر سید نے اس ناگواری کو ٹھوس کر کے دو تین طلباء کے لیے اپنے پاس سے بطور یونی فارم لباس تیار کرایا اور طلباء اور اسٹاف کے سامنے ایک تقریر کا انتظام کیا یہ سبیر سلاطین کو وہ اپنے ساتھ وہی لباس پہنا کر جلسے میں لے گئے اور کالج لائف پر ایک زبردست تقریر کی اور اس میں نماز باجماعت کی اہمیت اور لباس کی یکسانی وغیرہ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ”جو لباس اب تمہارا ہو یعنی ٹرکش ٹوپی اور کوٹ اور انگلیش بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے صرف اتنی بات ہو کہ تمہارے کوٹ

مختلف رنگ کے ہیں پس سب کو ایک وضع اور ایک رنگ کے کوٹ اختیار کرنے چاہئیں..... ہندستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم ہیں انگریز جو ہندستانوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسے ہیں جو ٹوپی، کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے جانے پر اعتراض کرتے ہیں مگر تمام اعلیٰ حکام اور عالی خاندان انگریز اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے..... جو انگریز ان باتوں میں ٹکرا کرتے ہیں میرے یقین میں وہ اس امر کے ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندستانوں اور انگریزوں میں دوستی و محبت اور اخلاص کا برتاؤ نہ ہو، باوجود ان کوششوں کے جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستی اور اتحاد پیدا ہونے کی کی ہیں میں ایسے انگریزوں سے جو ان باتوں میں کاوش کرنا ہی میں خود کبھی اس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا۔“ (صفحہ ۵۲۸ مجموعہ)

کالج میں جو طریقہ معاشرت تھا مولانا شبلی بھی نہ صرف اس کے ناجی تھے بلکہ وہ اس کو بھی ناپسند کرتے کہ غریب طلبا اور امیر و خوش حال طلبا میں کوئی امتیاز نمایاں ہو چناں چہ قسطنطنیہ کے کالجوں کے بورڈنگ ہاؤسوں کو دیکھ کر وہ اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ

”تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلبا رہتے ہیں لیکن یہ التزام ہو کہ خوراک لباس وضع مکان فرنیچر تمام چیزیں ایک سی ہوں اور طالب علموں کی حالت میں بقی مراتب کا کوئی شائبہ نہ ہو بورڈنگ ہاؤس کا کرایہ اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہو اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے ہیں اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے ہیں۔ تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں مختلف، صفائی خوش سیلی کی کا

نہایت اہتمام کیا جاتا ہے۔

.. ترکوں کی یہ عجیب قابل قدر فیاضی ہے کہ وہ باوجود زیادتی فیس کے غربان کالجوں کے فیض سے محروم نہیں ہیں، ہر کالج میں غریبوں کی معتدبہ تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں..... اس کا اثر یہ ہے کہ کالج کے احاطے میں جا کر کوئی شخص کسی طرح یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے طالب علموں کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے اور غربا کو اعلیٰ درجے کی معاشرت کا حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری کا مادہ پیدا کرتا ہے.....

”بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھے اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف، مراتب پر افسوس کرتا تھا لیکن میرا فوسس درحقیقت مدرسۃ العلوم کی حالت پر نہ تھا بلکہ قوم کے ان بزرگوں پر تھا جن کو خدا نے دولت اور مقدور دیا ہے لیکن یہ توفیق نہیں دی کہ اپنی فیاضی سے اس بات کی کوشش کریں کہ ہماری تعلیم گاہ میں غربا اور اہل قدرت ایک ہی بلند سطح پر نظر آئیں میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کانٹے میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری اور نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس وضع خوراک، مکان فرنیچر کلیدیہ ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطیجیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹا دی جائیں، اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روج نہیں“ (صفحہ ۴۹ و ۵۰ طبع ثانی)

اس بات کی تیسری بات کہ انسانی کمی و جہ سے ایثار اور قومی خدمت انجام دینا ہے۔

تو پہلے پر خیال رکھنا چاہیے کہ ہزار دو ہزار آدمیوں میں نفع سے چند ہی ایثار کرتے اور قومی خدمت انجام دیتے ہیں تاہم سرسید کے عہدِ اول کے بہت سے طلباء نے زبردست ایثار کئے اور قومی خدمات انجام دیں۔ سب کا احاطہ تو ناممکن ہے، چند نام بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ خواجہ سجاد حسین بی۔ اے علاوہ دیگر خدمتوں کے باوجود کبرستنی ایک عہدہ ہائی اسکول پانی پت میں چلا رہے ہیں اپنی کی کوشش سے اس کی عمارات تیار ہوئیں اور اس نے مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کی سید عبدالنبا بی ایم۔ اے اور میر ولایت حسین بی۔ اے نے باوجود دیگر اچھے مواقع ملنے کے کالج کی خدمت کو ترجیح دی اور آخر الذکر سبک دوشی کے بعد ۲۵ سال سے تعلیمی خدمات میں مصروف ہیں۔

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم بار ایٹا اور خاں بہادر شیخ عبداللہ ایڈووکیٹ نے قانون پیشہ ہونے پہ بھی مائل نہ ہوئے بلکہ انفرنس کالج اور یونیورسٹی کی خدمات میں اپنے وقت کا بڑا حصہ صرف کیا جو اگر پیشہ کے کاموں میں صرف ہوتا تو ہزاروں کی آمدنی ہوتی اور دونوں ہائی کورٹ کی ججی تک پہنچ جاتے کا نفرنس کالج کا استحکام اور زمانہ ڈگری کالج ان دونوں کی پڑائیاں خدمات کی زندہ یادگار ہیں ڈاکٹر مولوی حبیب الرحمن بی۔ اے ۲۱ سال سے اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں اور جن کے انہماک و ایثار نے انجمن ترقی اردو کو ایک کل ہند ادارہ بنادیا ہے اور جس نے ملک میں ایک عظمت حاصل کر لی ہے انہوں نے نہ صرف دماغی و جسمانی محنت کی بلکہ اپنی عمر بھر کا اندوختہ اور اپنا ذاتی نادور کتب خانہ بھی وقف کر دیا، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی پنجاہ سالہ خدمات سورج کی طرح روشن ہیں انہوں نے ہندوستان اور یورپ کی تعلیم سے فارغ ہو کر مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کو قومی کالج کی خدمت پر نثار کر دیا۔ مولانا شوکت علی مولانا محمد علی مولانا ظفر علی خاں

سیٹھ یعقوب حسن (مدراں) کی سیاسی خدمات اور ان خدمات میں سخت ترین مصائب کا تحمل تو عالم تشکا راہو، مولوی حاجی محمد حبیب اللہ خاں نے نہ صرف اپنی کوٹھی قیمتی ۲۵-۳۰ ہزار کی وظائف کے لیے وقف کی بلکہ انہی عمر میں جو راحت و آرام کی ہر دورہ کر کے اولڈ بوائز سے آفتاب ہاسٹل کے لیے رہنمائی کیا اور سوا لاکھ روپیہ قیمت کا ہاسٹل تعمیر کرا دیا جس کی آمدنی غریب بچوں کے وظائف کے لیے مخصوص ہے حاجی سر عبدالرؤف بار ایٹ لا اور صاحب نادہ سر سلطان احمد خاں نے پچاس پچاس ہزار روپیہ اپنی کمائی سے یونیورسٹی کو عطیہ دیا اور انہی کے کرنے کو نہ صرف مسلم یونیورسٹی بلکہ دہلی یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی، حالی اسکول اور دیگر امویہ میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ اور دیا۔ یہ چند مثالیں غالباً ایسے متعرضین کا کافی جواب ہیں۔

• سرو سامان کی گزرائی یا تکلفات کی فردانی حاکم قوم کی نقائی پر ہی منحصر نہیں ہر دولت اور طبیعت پر منحصر ہوتی، ہر قریب زمانے کے ایک نہایت مقدس عالم مولوی رشید احمد صاحب کے گھر کا منظر ایک نہایت محترم عالم مولوی عبدالحی صاحب ناظر ندوہ نے معارف (اعظم گڑھ جلد ۷۲) میں یہ دکھایا ہو کہ

”مولوی صاحب کے لباس و مکان میں بہت تمہلی ہو سب چیزیں آراستہ و قرینے سے رکھی ہوئی ہیں دو دو دیوار گھڑی، قالین کی جانماز، اونی چوتھی چوپرت کچی ہوئی چھوٹے چھوٹے ٹیکے رکھے ہوئے ایک عمدہ لنگڑا اس پر گدے پر گدے سفید چاندنی دُلای نہایت عمدہ الماری میں قرینے سے کتابیں جینی ہوئی، چٹائی کا کمرے میں فرش نہایت صاف و شفاف..... مولوی صاحب کے صاحب زادے بھی آئے ایک صوف کا سیاہ چنہ اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور دوسرے انگریز کے اوپر ایک فاختی رنگ کا بانٹ کا کوٹ پہنے ہوئے جس کے اطراف طلائی لیس

ڈوانگل ٹکی ہوئی اور لیس کے اوپر انگریزی کلابو کا نہایت عمدہ کام اور
آستینوں پر ترنج بنے ہوئے“

خود مولانا شبلی اگرچہ لباس مولویانہ پہنتے تھے لیکن مخصوص موضوعوں کے لیے
وہ بہت قیمتی ہوتا، غلام گڑھ میں سکونت کے لیے بنگلہ تھا، میز و کرسی تھی، اور مصنف
حیاتِ شبلی کے ہی الفاظ میں ”کھانے میں ہاتھ بہت کم آلودہ کرتے ان کے دستروں
پر چھپے بلکہ پھیری کا ثنا بھی ہوتا اور اسی سے بوٹیاں اور شرکاریاں وغیرہ کھاتے (۵۷ء)
آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا قصہ یہ ہو کہ جب تہذیب الاعلاق سہ بارہ
جاری ہوا، تو سرسید نے ایک طویل اور تاریخی مضمون لکھا تھا جس کا عنوان
تھا ”انگلے زمانے میں علوم دینیہ اور علوم عربیہ و فلسفہ یونانیہ کی ترقی کس وجہ سے
تھی اور اب کیوں تنزل ہو گیا ہو، اُس کے آخر میں لکھتے ہیں کہ

بعض علما مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ نئی روشنی والوں یعنی
انگریزی خوانوں اور ان کے حامیوں کو آگے بڑھ جانے دو اگر تم دینی
و مذہبی ترقی چاہتے ہو تو پیچھے ہٹو اور پچھلے لوگوں سے بلو اور یہاں تک
پیچھے ہٹو کہ پہلے ہٹتے صحابہ اور نبی آخر الزماں سے جا ملو، اسی حضرات!
پیچھے ہٹنا تو آسان ہی مگر صحابہ و رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک جا ملنا
نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہو مجھ کو خوف ہو کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے
گڑھے میں جا پڑو“ لاکھ علیٰ مشفا حفصۃ“ پھر ہم عاجزی سے کہتے ہیں
کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے تک پہنچنا تو دشوار ہی
مگر برائے خدا پیچھے ہٹنے کی نصیحت نہ فرمائیے جس جگہ مسلمان تھے اسی جگہ
ٹھہرے رہنے نے تو مسلمانوں کو اور مسلمانی سلطنتوں کو برباد اور قوم اسلام
کو ذلیل و خوار کر دیا، دُنیا میں جہاں مسلمان ہیں ایک ہی حالت میں ہیں پھر

”ان کو سمجھے ہٹا کر کیا کیجیے گا کیا ان کو معلوم کر دینے کا ارادہ ہو خدا نہ کرے
 جو علما (اور وہ غالباً خفی ہیں) نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے
 اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل آتا ہو ان کو
 یاد رکھنا چاہیے اور نہیں بھولنا چاہیے کہ الایمان لایزید ولا ینقص
 اور ان کو سوچنا چاہیے اور نہایت راست بازی سے کہنا چاہیے کہ اسلام میں
 اور دنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقص نہیں ہو اور اب بجائے
 اس کے کہ وہ پکارتے ہیں کہ زمانے کے رخ کے برخلاف حرکت کر مسلمانوں
 کو یہ سچی نصیحت کرنی چاہیے کہ > مع الدھر کیف اداہر -

اس مضمون میں نہ مولانا شبلی کا نام ہو نہ ان کی طرف کوئی اشارہ ہو نہ ندوہ
 کے جلسے یا اور کسی جلسے کا ذکر ہو معلوم ہوتا ہو کہ خود مصنف نے بھی اصل تقریر کو نہیں
 دیکھا سنی سنائی بات لکھ دی، پھر اس مضمون میں کسی ایک عالم کے قول پر بحث
 نہیں بلکہ دونوں موقعوں پر بعض علما کا لفظ ہو، خود مولانا شبلی جو علما کے لیے بھی آگے
 بڑھنا اور علوم جدیدہ کی تحصیل ضروری جانتے تھے ایسی نصیحت کسی طرح نہیں کر سکتے
 تھے اور لو فرضنا ان بعض علما میں وہ بھی ایک تھے تو سرسید کو عقہہ آنے کی کوئی
 وجہ نہ تھی، ان کو تو بڑے بڑے اختلافات کے موقع پر بھی غصہ نہیں آیا اور اس
 مضمون میں تو غصے کی کوئی جھلک بھی نہیں ہو۔

ساتویں شعاع ملاحظہ ہو :

”خود سرسید کی سوانح عمری کے لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ

بن گیا تھا آخر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی
 جائے وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں کیوں کہ وہ پاس رہتے تھے
 مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے چنانچہ اس بارے میں جتنی باتوں کا ذکر کریں

کی گئیں ان کو مولانا بہ لائف الجبل ٹٹاتے گئے اسی اثنا میں سرسید کے نام نواب اسماعیل خاں صاحب رئیس دناولی (علی گڑھ) کا ایک خط لکھ کر منظر سے آیا کہ انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی آپ کی لائف لکھ رہے ہیں مولانا کو یہ خط دکھایا گیا مگر اس مقدس خواب کی تعبیر بھی صبح نہیں نکلی اس کے بعد سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے مولانا اس کو مجھ سے لکھتے رہے جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو یہ عرض حال مولانا حالی مرحوم کے نام نکلا اور انھوں نے سال ۱۲۹۹ھ سے اس کو انجام دینا شروع کیا (۲۹۱-۲۹۲)

لیکن مولانا حالی حیات جاوید کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ”راقم کو سرسید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے“ اسی وقت سے میں نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے متعلق قلم بند کرنے شروع کیے اور کم و بیش تلو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسید کے پاس بہ مقام علی گڑھ اس عزیز سے بھیج دیے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں مگر وہ کاپی ان کے پاس یوں ہی پڑی رہی کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا میں نے یہ بھی چاہا کہ برس بھر مجھ پر خود علی گڑھ جا کر رہوں جہاں اس کے لیے قیام کرنا نہایت ضروری تھا مگر ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ مل سکا بعض صاحبوں کی رائے یہ ہوئی کہ سرسید کی زندگی میں ان کی لائف لکھنی مناسب نہیں اس کے جو وجوہات انھوں نے اس وقت بیان کیں وہ مجھے بھی معقول معلوم ہوئیں ان اسباب سے آخر کار یہ ارادہ موقوف کر دیا گیا کچھ دنوں کے بعد سرسید کے نہایت خالص مخلص دوست آئزہیل حاجی اسماعیل خاں سرسید

دنا کوئی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ مہتر لائف چہن تک عن ہوا دؤ زبان میں کلمہ
 پہنچی جائے چنانچہ ان کی تحریک سے منشی سراج الدین احمد مالک دہشتم
 چودھویں صدی سرسید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے انھوں نے بڑی کوشش
 سے ان کے لیے میٹرلی جمع کیا اور ایک خاص نام اس کو ترتیب دے کر
 حاجی عاصب کو دے دیا وہ مسودہ رکھا رہا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی
 چون کہ کرل گروہم اور منشی سراج الدین سرسید کی زندگی میں ہی ان کی لائف
 لکھنے کی راہ نکال پکے تھے میرے دل میں پھر ایک ولولہ اٹھا..... چنانچہ چھ
 سالہ ۱۹۰۶ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا جہاں خود
 سرسید اور ان کی لائف لکھنے کا سامان موجود تھا اور اس کے بعد کئی دفعہ اس
 کام کے لئے وہاں جا کر بیٹھا..... اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید کی
 لائف اگر ان کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جن کی وہ متوقع تھی اس کو
 مانس ہوتی دشوار تھی مگر ایک خاص وجہ سے ہم کو افسوس کہ وہ سرسید کی زندگی
 میں شائع نہ ہو سکی۔ اول اول تو جب کبھی سرسید کے سامنے ان کی لائف لکھنے کا
 ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے
 کہ ابراہیم میں خوب کتبیاں کیلین کٹوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ بھرے دیکھ
 اور بڑے ہو کر پھری، کافر اور بے دین کہلائے اور کہا ہی کیا ہو۔ مگر آخر میں
 جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے ان کو اس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ
 خیال معلوم ہوتا تھا کہ ان کی اخیر ابو گرنی میں کیا لکھا جا رہا ہو اور اسی لیے وہ
 اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس
 شخص نے چالیس برس مذہب کی حمایت میں بسر کیے ہوں اور سوائے کفر و بدیل
 کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو اس سے زیادہ کون شخص اس بات کے

دیکھنے کا خواہش مند ہو سکتا ہو کہ کوئی مسلمان اس کی تصنیفات پر بہ نظر انصاف بحث کرے۔
 نواب حاجی محمد انصیل خاں کے خط (از مقام مکہ منظمہ) پر ان کے ہی اس بیان
 سے روشنی پڑتی ہو جو انھوں نے سرسید کی لائف کے متعلق انٹی ٹیوٹ گزٹ ۳۲ جون
 ۱۸۹۶ء میں لکھا ہو کہ ان کو عرصے سے سرسید کی لائف لکھے جانے کی دھن تھی سرسید
 نے ہر چند ان کو روکا نہ مانے اور انھوں نے اولاً مولوی محمد شبلی نعمانی سے درخواست
 کی اگرچہ انھوں نے اسے بے کی مگر کچھ کیا نہیں۔ اب یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ کرنل
 گھریم نے ۱۸۹۶ء میں سرسید کی لائف شائع کی تھی اور مولانا حالی ۱۸۹۷ء کے بعد
 ہی جب کہ اس بڑے کام کی بنیاد پڑ چکی تھی ارادہ کر چکے تھے اور سرسید کو ان کے ارادے
 کا علم بھی ہو چکا تھا، لکن میں ان کی کافی شہرت علمی وقعت اور تصنیفی عظمت قائم ہو چکی
 تھی اور مولانا شبلی ۱۸۹۶ء تک صرف کانفرنس کے پلیٹ فارم پر متعارف اور ایک
 ہی مستقل تصنیف المامون سے علمی حلقوں میں روشناس ہوئے تھے تو مولانا حالی جن کی خود سرسید
 کے دل میں کمال عظمت تھی ان کے خالصانہ اصرار کو نظر انداز کر کے ان ترکیبوں سے مولانا
 شبلی ہی سے کیوں اصرار کرتے، مولانا حالی نے حیات جاوید کے ماخذ بھی بیان کیے ہیں
 اور یہ بھی لکھا ہو کہ ”خاندان بچپن اور تعلیم کے حالات خود سرسید کی زبانی لکھے گئے۔“ اگر مولانا
 شبلی سے سرسید حالات نوٹ کراتے رہے تو وہ بھی سوانح نگار کو حوالہ کر دیے جاتے اور
 مولانا حالی اس کا بھی ذکر کرتے۔

آخر بابو گرنی میں جو حالات لکھے جا رہے تھے ان کے معلوم ہونے کے خیال کی
 نسبت مولوی وحید الدین تسلیم معارف (علی گڑھ) جون ۱۸۹۷ء میں بسلسلہ تبصرہ حیات
 جاوید لکھتے ہیں کہ ”راقم نے سرسید کی زندگی کے اخیر پانچ سال ان کی صحبت و رفاقت
 میں بسر کیے ہیں یہ ہی وہ زمانہ ہو جب کہ مولانا لائف لکھنے میں مشغول تھے اور اس
 زمانے میں وہ کبھی کبھی علی گڑھ میں اور زیادہ تر پانی پت میں مقیم رہتے تھے وہ اکثر اپنی

عنایت و مہربانی سے لائف کے دوسے میں سے بعض نبض مضامین و حالات راقم کو
 سنا دیا کرتے تھے اور راقم کے حلقے میں ان مضامین کا جو دھندلا سا خاکہ باقی رہتا تھا
 اس کو راقم سرسید کی خدمت میں ان کے استاد پر بیان کروا کر تا تھا، وفات کے وقت
 کبھی انہوں نے بہ دریا فتنہ نہیں کیا کہ ان کے حالات کیا اور کس طریقہ سے لکھے جا رہے
 ہیں نہ راقم نے کبھی اس امر کو بیان کیا البتہ ان کی مذہبی تصانیف یا مذہبی خدمات کی
 نسبت جو کچھ دلانے لکھا اس کا ذکر ضرور آجاتا تھا جب راقم نے بیان کیا کہ مولانا
 نے آپ کے تمام کاموں کا محرک اور آپ کی ترقی کا باعث مذہب کو ٹھیرایا ہو اور بیان
 کیا ہو کہ ایشیا میں کوئی بڑا کام کسی شخص سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مذہب کا پابند
 نہ ہو تو انہوں نے مسکرا کر فرمایا کہ بے شک میں نے جو کچھ کیا ہو اس کا محرک مذہب
 ہی تھا اور وہی چیز ہو جو سخت سے سخت محنت کو خوش گوار بنا دیتی ہو، غالباً جاہل سے
 بیان سے مولانا کے اس بیان کی کافی تصدیق ہو جائے گی کہ وہ صرف اس بات کے دیکھنے
 کے خواہش مند تھے کہ ان کی مذہبی خدمات کی نسبت کیا لکھا جاتا ہو کسی اور بات کے دریافت
 کرنے کی ان کو مطلق خواہش نہ تھی۔

• اسی لائف کے سلسلے میں آگے چل کر مصنف حیاتِ نبلی کہتے ہیں کہ
 ”یہی سبب ہو کہ سرسید کی وفات پر اُن کی زندگی کے کارناموں پر جب
 مختلف مضامین کا لکھا جانا طے ہوا اور اس سلسلے میں ”سرسید اور مذہب“ کا
 عنوان مولانا نبلی کے لیے تجویز ہوا تو انہوں نے اس سے انکار کیا آخر لوگوں
 کے اصرار سے مجبور ہو کر سرسید اور اُردو لٹریچر کا دوسرا عنوان لیا اور پہلے
 مضمون پر مولانا حاکمی نے لکھا۔“

اس فقرے میں جو لفظ اصرار ہو اس پر حاشیہ ہو کہ ”اس اصرار کی تصریح مولانا
 نے خود اس مضمون میں کی ہو، پہلے مضمون کی تجویز اور انکار کے متعلق کوئی زبان

یا تحریری حوالہ نہیں، البتہ اصرار کی طرف تصریح کا اشارہ ہی، اب اس تصریح کو بھی پڑھنا چاہیے مولانا شبلی آخر مضمون میں لکھتے ہیں کہ

”حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو انشا پر دازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لیے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہی وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہوں گے اور خوب لکھا ہوگا“

میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ اس وقت جب کہ تمام ملک میں سرسید کا وزہ نام گونج رہا ہے اور ہر شخص اُن کے ناموں کے سننے کا مشتاق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیے میں نے اس کی تفصیل کی وجہ سے میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا ہے

بھلا تر دو بے جا سے اس میں کیا حال اٹھا چکے ہیں زمین و آسمان زمینوں کو
اب ناظرین خود مصنفِ حیاتِ شبلی کی سخن فہمی اور ”انکار و اصرار اور مجبور“ کی معنی آفرینی کی نسبت فیصلہ کر لیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پہلا عنوان سرسید کی زندگی کا سب سے بسیط اور اہم مضمون ہے اور وہ سب کالج والے جنہوں نے مولانا شبلی سے مختصر طور پر مضمون لکھنے کی خواہش کی ہو جانتے تھے کہ لائف لکھی گئی ہے اور مولانا حالی نے اس کو لکھا ہے لہذا مولانا شبلی یہی سب سے درخواست نہ صرف بے موقع تھی بلکہ مولانا حالی کی توہین تھی، مولانا حالی نے اس مضمون پر برسوں غور کیا تھا اور لکھ چکے تھے ان کے لیے بالاختصار لکھنا کسی دوسرے کے مقابلے میں آسان تھا اور انہوں نے ہی لکھا اور اس کی تہنید میں جتا دیا کہ

”سرسید کی لائف میں من جملہ ان مختلف حیثیتوں کے جو اُن کی ذات میں متعین ہیں

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ ان کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت پر جس
تپان کی لائف میں جو عنقریب شائع ہونے والی ہو ہر ایک پہلو سے نظر
ڈالی گئی ہو۔

مولانا شبلی نے شعرا لعم کے سلسلے میں بھی اسی طرح کا ایک فقرہ لکھا ہے جس کو
مصنف حیاتِ شبلی نے بھی تہید کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔

”شعرا لعم حصہ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں اس لیے پس و پیش کیے
تھے کہ حالی کے بعد اس میں کیا اضافہ کیا جاسکتا ہو لیکن مجبوراً سعدی کے حالات
لکھے تو اس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا ”مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے
حیاتِ سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے
بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہو لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار
کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔ (۸۰۲)

اسی طرح سرسید کے متعلق بھی سمجھنا چاہیے تھا۔

”آٹھویں شعاع“ عربی تعلیم کی ترقی اور اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں وہ
کو اختلاف تھا، سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ ہر ایسی تعلیم کے شیوع کو
جو ان کو اُدھر سے ہٹائے مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے..... بہر حال
ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لیے دل چسپی نہ تھی کہ وہ مسلمانوں
کو آگے بڑھنے سے روکیں گے مولانا کا عقیدہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم
نہ رہی تو پھر مسلمان مسلمان رہیں گے کہاں جن کی ترقی کے لیے یہ جدوجہد
ہو رہی ہو“ (۲۹۲)

اس کے بعد ستمبر ۱۸۶۷ء میں ندوۃ العلماء قائم ہونے اور مولانا کی زندگی کا مقصد بننے کا ذکر

سلطہ یہاں پنجاب اور الہ آباد دو یونیورسٹیوں میں مشرقی تعلیم کی مخالفت کا ذکر ہے۔

کر کے لکھا ہو کہ کالج میں مولانا کی زندگی کا یہ رخ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا
 شاید شائع میں جب مولانا کو حیدر آباد سے وظیفہ ملا ہو تو فطناً ان کو خوشی ہوئی کہ
 اب وہ کالج کے حلقے سے آزاد ہو کر اپنے مذاق کا کام کریں گے، اسی جذبے میں
 انہوں نے ایک فارسی قصیدہ کہا تھا جس کا تانیہ ادب، طلب اور ردیف
 ”است“ تھی اس میں ایک مصرع تھا ”زین پس ز وہ“ وہ پس علوم غرب است
 یہ تعید کالج کے احاطے میں قابل اعتراض ٹھہرا اور مولوی سید علی بگڑائی کے
 مشورے سے مولانا نے اس کو نشانہ کر دیا۔ ۲۹۳

اب روشنی میں واقعات کو دیکھیے۔ ۱۸۸۶ء میں مسرید نے کانفرنس
 کے جو مقاصد قرار دیے ان میں (حرف ج) یہ مقصد بھی تھا کہ ”جو لوگ علوم مشرقی
 اور دینیات کی تعلیم قدیم طریقے پر ہماری قوم کے علما سے پاتے ہیں اور اس کو انہوں
 نے اپنا مقصد قرار دیا ہو ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں اس تعلیم کے قائم رہنے
 اور جاری رہنے کی مناسب تدابیر عمل میں لانا“ کانفرنس کے اولین اجلاس ہی میں
 یہ رزلویشن یہ تحریک مولانا شبلی اور بنائیہ سرسید پاس ہوا کہ اس جسے کی رائے
 میں مسلمانوں کو یورپین سائنس و لٹریچر کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کی شدید ضرورت ہو قوم اور
 گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ چاہیے انگریزی کالجوں میں مشرقی زبانوں کا بطور
 سکند لیٹنگوج کے رہنا کافی ہو، خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ
 درکار نہیں ہو وہ جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقے پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعے
 سے ہوئی ہو اس کو اسی طرح رہنا چاہیے اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی رہنے پر
 ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہیں توجہ رکھنا لازم ہو، مشرقی علوم جو
 مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے
 مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہو سکتے اور اس گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں

اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج رکھا جائے تو کوئی شخص جو مشرقی علوم کا خواہاں ہو اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کو اختیار کرے گا تو مسلمانوں کو نہیں ہوگی :-

سنہ ۸۷۰-۸۸۸ء میں ایک دوسرے مزدولیشن کے مطابق تعلیمی سرسید ہوئی اس میں ایسے مدارس کا جہاں عربی تعلیم ہوتی تھی اور ایسے علماء کا جو ان مدرسوں میں یا اپنے گھروں پر پڑھاتے تھے تفصیلی تذکرہ تھا (رپورٹ کافرنس) ۱۸۵۸ء میں سرسید نے نواب عماد الملک کو لکھا تھا کہ "اسی کے ساتھ میں یہ تدبیر چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور دوسرے کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہو کسی طرح قائم رہے اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی :- (مجموعہ خطوط سرسید)

سنہ ۱۸۶۱ء میں خود مدرستہ العلوم (ایم۔ اے۔ اسکالرشپ) میں بیفہ علوم مشرقی قائم کیا گیا علوم ادبیہ اور دینیہ کی تعلیم کا خاص نصاب بنایا گیا ترغیب کے لیے وظائف اور میڈل مقرر کیے گئے مگر یہ حقہ ہمیشہ تعداد طلباء کے لحاظ سے ضعف کی حالت میں رہا اور مجبوراً سنہ ۱۸۷۵ء میں بند کرنا پڑا۔ باوجود اس ناکام تجربے کے سنہ ۱۸۹۷ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ اگر کالج کے طلباء آمادہ ہوں کہ بی۔ اے کی وکری لینے کے بعد فقہ و تفسیر و حدیث پڑھیں اور مناسب تعداد ہو تو فی الفور اس کا بندوبست کیا جائے گا۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں کافرنس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں عربی کو بطور زبان ثانوی لینے کے لیے وظائف مقرر کیے جائیں۔

اب ندوہ اور سرسید کا تعلق بھی نیلے۔ سرسید کو ندوہ کے جلسے کی اطلاع پیشیت ایڈیٹر انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے کی گئی تو سرسید نے ایک نہایت حوصلہ افزا

جواب لکھا اغراضِ ندوہ کی تعریف کی اور نہایت زوردار پیرائے میں جدید علم کلام کی تدوین پر توجہ دلائی اس کا آخر فقرہ تھا کہ

”جو مسائل حکمت و فلسفہ طبیعیات کے علوم جدیدہ کے ذریعے سے پیدا ہوئے ہیں ان کے لیے وہ علم کلام جو یونانی فلسفہ و حکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے اور تفاسیر قرآن مجید اور تفاسیر حدیث شریف اور دیگر کتب مصنفہ اہل اسلام میں اس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا اور اس سبب کے الحاق و زندہ مسلمانوں میں پھیلنا جاتا ہے جو نہایت سخت وبا ہے جس کی روز بہ روز ترقی ہونے کی امید قوی ہے پس اس کا کیا علاج ہے امید ہو کہ آپ میرے اس عریضے کو ندوۃ العلماء کے سامنے پیش فرمادیں گے اور جو ہدایت علما کی اس باب میں ہو اس کو مشہر فرمادیں گے تاکہ مسلمان اس آفت سے جس کی پناہ کسی جگہ نہیں معلوم ہوتی محفوظ رہیں۔“

(مجموعہ لکچرز سرسید)

اس خط کے بعد جب ندوۃ العلماء کی روداد کا حصہ اول بغرض ریویو موصول ہوا تو سرسید نے لکھا کہ ”اس پر ریویو لکھنا اور فرائض ریویو نویسی کو پورا کرنا اگر قدر مشکل اور نامناسب ہو ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے اس کو چلنے دینا چاہیے خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے میں اس کی رسید اخبار میں بچاؤں گا اور نواب محسن الملک مولوی سید ہمدی علی کافرلش کے اجلاس میں ریزولیشن پیش کریں گے اور جو آپ کا ارشاد ہے اس پر اے میں اس کی تعمیل ہو جائے گی اگرچہ مجھے کچھ توقع نہیں کہ باہم علما کے اتفاق ہو الا کو شش ضرور ہو۔“

اس کے بعد ہی دسمبر ۱۸۹۷ء میں نواب محسن الملک نے یہ رزولیشن پیش کیا ”اس کافرلش کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلماء جو بہ مقام کان پور منعقد ہوا

نہا اور جس میں علما اور اکابر دین جمع ہوئے تھے عام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہو اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقہ تعلیم و رفع نزاع یا ایسی نہایت عمدہ اور مفید ہیں تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی و دنیوی بہبودی مقصود ہو بہ دل و جان قلم سے قدم سے درم سے مدد کرنی چاہیے۔“

نواب حسن الملک کی یہ تقریر ان کی معرکہ کی تقریروں میں سے ہو سید محمود نے اس رزلویشن کی تائید کی ان کی اُردو تقریریں بہت کم ہیں تاہم یہ ایک ہی تقریر ہزاروں پر بھاری ہو، انہوں نے اور باتوں کے علاوہ ماہر قانون کی حیثیت سے بھی اُس کے فائدوں پر روشنی ڈالی۔ پھر کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۷ء میں ایک رزلویشن پیش ہوا کہ اوقات کے رُپیہ سے انگریزی تعلیم کو مدد دی جائے تو سرسید نے سخت اختلاف کیا کہ جو اوقات عربی تعلیم کے لیے ہیں اُن سے عربی تعلیم ہی جاری رکھی جائے ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم ندوہ کے قائم کیے جانے کی تائید کی گئی۔

اب مشرقی تعلیم کی نسبت مولانا شبلی کی رائیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مولوی حمید الدین کو فردری سن ۱۸۹۷ء میں لکھتے ہیں کہ

”خط سے معلوم ہوا کہ عربی عبارت لکھی ہو داؤد بھائی کے پاس بھیجے ہو اس قسم کے ہملات کام کرو گے عربی عبارت لکھ کر اپنا دل خوش کرو گے کہ دوسرا حریری پیدا ہوا اچھا پھر غیبہ کیا؟ مسلمانوں کو آج کل حریری اور احرار القیس کی ضرورت ہو۔“ (مکاتیب حصہ دوم صفحہ ۱۱)

علاوہ ازیں ایک اور رائے بھی ملاحظے کے قابل ہو جو انہوں نے مشرقی کانفرنس ۱۹۱۱ء کے سلسلے میں ظاہر کی ہو۔

”مشرقی تعلیم کی تحریکیں اس سے پہلے ہی ہوئیں ڈاکٹر لائیٹر کی سرگرم

کوششوں سے پنجاب میں تعلیم مشرقی کی ایک شاخ یونیورسٹی میں قائم ہوئی
 الہ آباد یونیورسٹی میں تلاً اور فاضل کے امتحانات اسی خیال کے ماتام خاکے
 ہیں، سرسید مرحوم نے ہمیشہ ان کوششوں کی سخت مخالفت کی پنجاب یونیورسٹی
 پر ان کے تین پڑ پڑ اور ایک قلعہ شکن تو ہیں تھیں جن کے صدمے نے مشرقی تعلیم
 کو چکنا چور کر دیا الہ آباد یونیورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس
 میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس ذمہ
 کے لکھے کہ اس تجویز کے پرچے اڑ گئے، سرسید کی مخالفت اس پر مبنی تھی کہ وہ
 سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم کی یہ کوشش مغربی تعلیم کی ترقی کو روک دے گی جو
 ملک کے لیے نہایت ضرور سا کام ہو اس میں ایک ذرہ شبہ نہیں کہ اگر ہم کو یہ
 یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے مغربی تعلیم میں ایک ذرہ بھر بھی کمی ہوگی
 تو ہمارا فرض ہو کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کریں مسلمان اس وقت
 کش مکش زندگی کے میدان میں ہیں ان کی ہم سایہ قومیں مغربی تعلیم ہی کی بدولت
 ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں اگر خدا نخواستہ مسلمان مغربی تعلیم میں زرا
 بھی پیچھے رہ جائیں تو ان کی ملکی اور قومی زندگی دفعتاً برباد ہو جائے گی۔ لیکن
 اب وہ حالت نہیں رہی مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی دنیوی ترقی
 صرف اس بات پر موقوف ہو کہ ان کا ایک ایک سچے انگریزی میں تعلیم یافتہ
 ہو جائے لیکن باوجود اس کے یہ ممکن ہے کہ مشرقی تعلیم کے لیے بھی جگہ کھل سکے
 ترقی یافتہ قوموں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے یورپ سب کچھ کر رہا ہے
 تاہم ان میں ایک وسیع گروہ موجود ہے جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر
 کا محافظ ہے۔“

مولانا شبلی کا حیدر آباد سے یہ اس غرض و طیفہ مقرر ہوا تھا کہ معمولی درس و

تدریس سے یکو ہو کر تصنیف و تالیف کریں گے، یہ وظیفہ کالج کی تنخواہ کے مساوی تھا اور یہ مولانا جیسے شخص کے لیے ایک نعمت تھی کہ آزادی کے ساتھ تصنیف و تالیف پر مہر و فہم ہوں۔ مشہور میں مولانا خالی کا وظیفہ بھی اُن کے مشاہیرہ کے مساوی حیدر آباد سے ہی مقرر ہوا تھا اور اگرچہ وہ اتنے پابند نہ کیے گئے تھے مگر ملازمت سے مستعفی ہو گئے، اسی طرح مولانا شبلی کو بھی مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر بشرطہ کہ یہ روایت صحیح ہو) انھوں نے ”زیں پس ندوۃ و تدریس علوم عرب است“ کا لغزہ لگایا، مگر چون کہ اس نعرے کا اثر تو وظیفے پر پڑتا تھا نیز اس سے ندوہ کے لیے پابندی عائد ہوتی تھی علاوہ بریں حیدر آباد میں ایک عہدے کی توقع تھی (جیسا کہ بعد کو وقوع میں آیا) اس میں خلل پڑتا اس لیے کہا جاتا ہو کہ دوستوں کے کہنے اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورے سے جو ریاستی حالات سے خوب واقف تھے مولانا نے اس نظم کو شائع کر دیا۔ باایں ہمہ ہم کو ابھی تک یقین نہیں کہ مولانا نے اس وقت نظم بھی ہو خود مصنف کا لفظ ”شاید“ اس روایت کو مجروح کر دیا۔ جو تعجب ہو کہ اس یاد کا نظم کا صرف ایک ہی مصرعہ یادگار رہ گیا اور وہ بھی اس لیے کہ کالج کے احاطے میں قابل اعتراض ٹھہرے اور مولانا کی زندگی کا رخ ابھی نظروں سے نہ دیکھا جائے، احاطہ کالج سے مراد اینٹ پتھر تو نہیں سکرپٹری پرنسپل اسٹاف طلباء اور ٹرنیٹر مراد ہیں مگر مصنف ان میں سے کسی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ کس نے قابل اعتراض ٹھہرایا اور کس نے اس رخ کو بُری نظر سے دیکھا مولانا آخر صفر ۱۳۱۲ (اگست ۱۹۹۵ء) میں حیدر آباد گئے تھے چار پانچ ہفتے وہاں مقیم رہے، سب سے پہلی شانی کو فرمان وظیفہ صادر ہوا۔ اور سب سے پہلی ان کو مولانا کے اعزاز میں ایک جسنہ تہہ بجا۔ جس میں ایک پاسنہ پیش کیا گیا، مولانا تبرکاتِ یسر سے ہفتے تک حیدر آباد میں رہے اگر یہ تصدیق لکھا بھی ہو گا تو حیدر آباد میں کیوں کہ مہر و فہم سے وہ خوش ہوتا۔

نمایاں ہو جو کسی خوش خبری کے سنتے ہی دل میں پیدا ہوتا ہو، اور مصنف حیات بشی کی عبارت کا پروانہ بھی یہی ہو اب کالج کے احاطے میں اس کا قابل اعتراض ٹھیکرانا مولوی سید علی بلگرامی کا مشورہ دینا کہ ضائع کر دیا جائے خواب کی سی باتیں ہیں کیا سید علی بھی ساتھ ہی ساتھ آئے تھے، اور پھر جب کہ مولانا علی گڑھ کی کشمکش سے یکسوئی اختیار کرنا چاہتے تھے، اور خوش قسمتی سے یہ موقع ہاتھ آگیا تھا اور انھوں نے وزارت میں یہ تمنا بھی ظاہر کر دی تھی (جیسا کہ فرمان میں درج ہو) کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں۔ تو کالج کے کسی اعتراض کا اتنا خوف کیوں تھا کہ نظم کو ضائع کر دیا جائے۔

علی گڑھ سے گھبرانا بھی طبع زادی و طیفی کے بعد ہی مولانا علی گڑھ واپس آتے ہیں ”میں علی گڑھ آگیا ہوں اور حالات اس قسم کے پیش آگئے ہیں کہ ابھی یہیں بہت اڑ پڑے گا۔“ (خط موسومہ مولوی حمید الدین ۱۹۰۲ء ۲۲ دسمبر ۱۸۹۹ء مکاتیب حصہ دوم)۔ ۱۸۹۹ء کے بعد کالج سے قطع تعلق ہونا ہو لیکن جون ۱۸۹۹ء میں پھر مولوی حمید الدین کو کہتے ہیں کہ ”میں یہاں سے چھوٹا تو اعظم گڑھ نہیں بلکہ ندوے میں رہو گا یا کالج میں، وطن سے جی سیر ہو گیا (خط علی) مولانا ابھی حیدرآباد میں ناظم شعبہ علوم و فنون ہیں کہ ان کی نسبت کسی نے وہیں سے ذاب حسن الملک کو ایک خط لکھا کہ کالج کی بُرائیاں اور کمزور چیںیاں کرتے رہتے ہیں یہ خطر رفع اعتراضات کی غرض سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہو گیا (اور اس سے اخبار البشیر اٹا وہ میں نقل ہوا، اس کو پڑھ کر مولانا نے ۱۱ اپریل کو حسب ذیل خط بغرض اشاعت لکھا۔

”جناب ذاب حسن الملک بہادر، کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ ایک شخص جس

نے ۱۶ برس تک کالج کی وفادارانہ خدمت کی ہو !

..... جس نے اپنی مشہور تصنیفات کا حق تصنیف کالج

کو دیا جس نے اپنے مقدمہ کے موافق وقتاً فوقتاً کالج کی مالی اعانت کی ہو جو اکثر کانفرنس کے جلسوں میں اب تک شریک ہوتا رہا ہو اور جو اب بھی یہ خواب دیکھتا رہتا ہو کہ اگر اس کو موجودہ تعلقات سے آزادی مل سکے تو پھر کالج کے احاطے میں دہائی سال کا بڑا حصہ کالج کی خدمت میں بلا کسی مالی معاوضے کے صرف کرے اس کی نسبت باغیانہ خیالات منسوب کیے جائیں تو نواب محسن الملک بلا اس دریافت کے کہ نویندہ کو کن شخص ہو اور اس کا کیا پایہ ہو اور یہ کہ نویندہ نے جو واقعہ بیان کیا ہو وہ کسی سبکدوش موقع کا واقعہ ہو یا پرائیوٹ اسٹریٹ سمیٹ ہو اس خط کو چھاپ دیں اور پھر تمام قوم میں ایک غفلت برپا ہو جائے اور لوگ اس کی بنیاد پر مضامین کا تار باندھ دیں انھذا الشی عجیب۔

ہمارے بزرگ مولانا حالی نے بالکل سچ کہا ہے

اگر سن میں کسی قومی جماعت میں شکر رنجی

ہزاروں ہوں گے یہ بقال سن کر شادماں ہم میں

مولوی بشیر الدین نے اسی بات پر تو نواب صاحب کو ٹوکا کہ ایسا خط نہیں چھاپنا چاہیے لیکن خود بھی اس خط کو چھاپ دیا خوب شد کہ در نماز دم نہ زد۔ حالانکہ خط کا محض حوالہ دنیا کافی تھا، بہر حال جو ہوا ہوا اور بچنا جو کچھ لوگوں نے سمجھا انگریزی میں ایک مثل ہو کہ الزام سے بچنا اپنے آپ کو الزام میں ڈالنا ہی، میں نے اس پر عمل کیا تھا اور اب بھی اسی پر عمل کرنا چاہتا ہوں اور ہمارے دوستوں کو اس قدر کان کا کچا اور ٹھہلے یقین دہننا چاہیے والسلام۔ شبلی۔

(نواب صاحب نے اس خط پر یہ نوٹ کیا کہ ”مولانا کو یقین رکھنا چاہیے کہ

ان کے دوستوں اور جاننے والوں میں سے کوئی شریفینا اور سمجھ دار آدمی کان کان کچا
اور ڈنسل (تین نہیں)

اس ناگوار واقعے کے بعد بھی ۲ مئی ۱۹۰۷ء کو ہمدی جن کو اکھتے ہیں کہ نہانا
ایسے نظر آتے ہیں کہ علی گڑھ کے دام میں دوبارہ گرفتار ہوں اگرچہ یہ وہ دام ہو کہ سہ
نالہ از بہرہ ہائی نہ کند مرغ اسیر خود افسوس زلے کہ گرفتار ہونہ (نقطہ ۱۱)
ان واقعات کو پڑھنے کے بعد مولا شبلی کا آخر زندگی کا ایک تین اعتراف اور
قابل ملاحظہ ہو ۱۹۱۲ء میں اخبار البشیر (ٹاؤن) میں ندوہ کے خلاف جو مضامین
شائع ہوئے تھے اس سلسلے کے ایک مضمون میں یہ فقرہ بھی تھا کہ ”اسی وجہ سے
مجددِ اعظم سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے ہو کہ وہ انگریزی علوم و فنون کو مسلمانوں
کی تمام دینی و دنیوی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے“ مولانا نے ان کے جواب میں ایک
مضمون شائع کیا اور اس خاص فقرے کے متعلق لکھا کہ ”ندوہ جب قائم ہوا تو سرسید
مرحوم نے اس کی تائید میں متعدد آرکھل لکھے علی گڑھ میں ایک کانفرنس کے اجلاس
میں خود سرسید مرحوم شریک تھے نواب محسن الملک نے ایک خاص رزلویشن ندوہ
کے مقاصد کی تائید میں پیش کیا اور نہایت مفصل تقریر کی سید محمد ثناء نے اس رزلویشن
کی پُر زور طریقے سے تائید کی جس میں یہ بیان کیا کہ ہمارے دو کام ہیں دین و دنیا
ہم نے دنیا کی ترقی کا کام اپنے ذمے لیا ہو ندوہ دین کا کام انجام دے رہا ہو اس لیے
ہم کو اس مقصد سے پورا اتفاق ہو یہ دونوں تقریریں مفصل ہیں اور کانفرنس کی طرف
سے شائع ہو چکی ہیں سرسید مرحوم کے بعد بھی یہ پالیسی برابر قائم رہی ڈھاکہ کانفرنس
میں ندوہ کی تائید کا رزلویشن دوبارہ پیش ہوا اور نواب وقار الملک نے زور کے
ساتھ اس کی تائید کی ”کیا یہ واقعات غلط ہیں کیا کانفرنس کی رودادوں میں پتھر پریں
جو وہ نہیں ہیں اگر ہیں تو کیا مولوی بشیر الدین صاحب ہم سے اس بات کے خواہاں

ہیں کہ ہم سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک سے بغاوت کر کے مولوی بشیر الدین کے علم کے نیچے آجائیں“

اس کے بعد اور الزامی جواب دے کر لکھتے ہیں کہ ”کیا انکی یہ مطلب ہو کہ صرف انگریزی علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا اور عربی زبان اور مذہبی علوم سے بے بہرہ ہونا تمام دینی و دنیوی ترقی کا وسیلہ ہو اگر یہ مطلب ہو تو یہ محض تہمت ہو کہ سرسید مرحوم کا یہ خیال اور یہ رائے تھی، سرسید کے زبان و اب بھی موجود ہیں اور مجھ کو ہرگز توقع نہیں کہ نواب وقار الملک اور ارکان کالج اس رائے کو سرسید کی طرف منسوب کرنے پر راضی ہوں گے“ (مقالہ شبلی جلد ہشتم مطبوعہ دارالمنہین صفحہ ۱۱۲-۱۱۶)

یہ مقالات خود مصنف نے ہی ۱۹۳۶ء میں جمع کر کے اپنے دیباچے کے ساتھ شائع کیے ہیں تاہم حیات شبلی میں سرسید پر تہمت محض نکالتے ہیں نہ خوف خدا اور نہ شرم بہیمہ۔

لنویں شعاع میں (جو آخری شعاع ہو) یہ فقرہ لکھ کر کہ ”اختلافات کے قسیدے کا آخری بند سیاسی اختلاف ہو“ (۲۹۴) رسالہ اسباب بغاوت ہند کا نگاہ کی مخالفت پیٹر الملک ایسوسی ایشن وغیرہ کا تذکرہ اور یونین کے مباحثہ (جمہوری و شخصی حکومت) کا اعادہ کیا ہو۔

ہر شخص جانتا ہو کہ یہ واقعات ہندستان کی سیاسی تاریخ کے بہت ہی اہم اور نمایاں اجزاء ہیں سیاست کوئی الہامی شریعت نہیں موقت اور اقتضائے حالات کے تابع ہوا کرتی ہو سرسید کی پالیسی بھی اُس زمانے کے مقتضیات پر مبنی تھی اور وہ نہ صرف جمہور مسلمانان کے نزدیک مقبول تھی بلکہ اکثر ہندو باعین سرسید کے مشن میں سرسید نے ایک سیاسی انجمن قائم کی تھی۔

سے بھی آگے بڑھ گئیں اور انھوں نے انڈین لائل ایسوسی ایشن قائم کی اور کانگریس والوں کی زبان بندی چاہی، کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اس کو بنگالیوں نے قائم کیا سرسید نے تین سال رفتار حالات دیکھ کر مخالفت کی مگر صاف الفاظ میں اعلان بھی کر دیا تھا کہ کانگریس والوں سے ہم کو کچھ عداوت نہیں ہو ہم میں اور ان میں رائے کا اختلاف ہو، ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں ہم مسلمانوں کے لیے اور راجپوتوں کے لیے بالخصوص اور ہمارے ملک کی دیگر اقوام کے ہندوؤں کے لیے اور بالخصوص ملک کے امن کے لیے نہایت مضر ہو اس لیے ہم اس کے برخلاف ہیں " انھوں نے اسلامی انجمنوں کے نام جو خط لکھا تھا اس میں ایک مبلغ فقرہ یہ بھی تھا کہ " اگر بہ فرس حال کانگریس کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ہندستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہو کہ وضعت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ، بہت زیادہ بدتر ہو جائے گا " اب دیکھیے کہ تین چوتھائی صدی کے بعد بھی جمہور اہل اسلام پھر اسی وقت مسکنت اور غضب الہی سے بچنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں، اور اس وقت بھی یہی ایک نظریہ جو اس فقرے میں ہو سرسید کی سیاسی دھڑیل کی دلیل مہربن ہو، سرسید علی سیاست میں اس وقت داخل ہو چکے تھے جبکہ مولانا شبلی نے جنم لیا تھا لیکن ان باتوں سے قطع نظر مولانا کا سیاسی اختلاف تھا کہاں، یونین کا مفروضہ مباحثہ تو طرز حکومت کے ایک اصول و نظریہ سے متعلق ہو ملک کی اس وقت کی سیاست سے تو کوئی تعلق نہیں رکھتا، اختلاف اور اس کا اثر دو برابر کے آدمیوں میں معلوم ہوتا ہو، مولانا شبلی کی سیاسی شخصیت عمل و فکر کے لحاظ سے اس وقت شتمہ برابر بھی وقعت نہ رکھتی تھی۔

اس کے بعد مصنف حیات شبلی نے نہایت سخت الفاظ میں سرسید پر حملہ کیا ہو۔

کہتے ہیں کہ ”۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں روم و یونان کی لڑائی ہوئی اور اس میں کون کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف جو فتح عظیم ہوئی اُس نے ہندستان کے مسلمانوں کو پُر جوش بنا دیا تھا سارے ہندستان میں اس کی خوشی منائی گئی اور ممبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا سرسید کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور اس جوش مسرت کے خلاف دہنایت سخت مضمون لکھے جو اتحاد اسلامی کے حامی مسلمانوں کو تیر کی طرح آکر لگے اور انھوں نے سرسید کی اس انگریزی دوستی پر سخت اعتراضات کیے۔“ (۲۹۵)۔

مصنف نے حاشیہ پر سرسید کے دو مضمونوں ”یونان اور ترک“ اور ”سلطان اور ہندستان کے مسلمان“ کا بھی حوالہ دیا ہو لیکن ان کا کوئی اقتباس نہیں پیش کیا، واقعہ یہ ہے کہ سرسید نے دو نہیں بلکہ پانچ مضمون لکھے تھے جن میں بعقیدہ تین کے عنوان یہ ہیں :-

(۱) عیسائی اور مسلمانوں میں باہمی مودت (۲) خلافت اور خلیفہ (۳) ترکوں کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی ہم دزدی، مضمون محولہ حیاتِ نبویؐ بہ لحاظ سلسلہ ہوا ہے۔ اب ہم ان مضامین کے کچھ اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں تاکہ مصنفِ حیات کے تیروں کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) پہلے مضمون میں مذہبی اور تاریخی بحث کے بعد سرسید نے لکھا کہ ”حال کے زمانے میں آرمینیا والوں نے بغاوت اور شرارت کی اور یونانیوں نے سر اٹھایا جس کی سزا وہ پارہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اپنے کیے کی اور سزا پاویں گے اس ضاد کو مذہبی عداوت پر مبنی کرنا محض غلطی اور سراپا دھوکہ ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی لڑائی امور پر مبنی ہے جس کے سبب سے آرمینیا والوں نے بغاوت کی اور یونانی جنگ پر آمادہ ہوئے ہاں ان ضادات کے ساتھ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا آرمینیا والوں اور ان کے مغربوں نے اور یونانی اور ان کے طرفداروں نے مذہبی جوش کو بھی شامل کر لیا

جو محض ایک جھوٹا بہانہ ہو، اگر ہم تسلیم کر لیں کہ سلطان کی عمل داری میں انتظام نہایت خراب ہو اور آرمینیا والوں نے اس خراب انتظام میں وجہ سے بغاوت کی، تو تب بھی یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ یہ فساد مذہبی عداوت کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ بد انتظامی کے سبب سے ہوا اور یہ کہنا کہ سلطان کی عمل داری میں عیسائیوں پر ظلم ہوتا ہو ایسا جھوٹ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا، عیسائی سلطان ترکی کی عمل داری میں نہایت مذہبی آزادی سے رہتے ہیں اور جتنی رعایتیں ان کے ساتھ کی جاتی ہیں اتنی رعایتیں مسلمان رعایا کے ساتھ نہیں کی جاتی ہیں۔ مذہبی آزادی جو ترکوں کی عمل داری میں عیسائیوں کو حاصل ہو کسی عمل داری میں عیسائیوں کو حاصل نہیں سلطان ان کے مذہبی مراسم میں مطلق دست برداری نہیں کرتا بلکہ ان کی خواہش پر ان کے لیے ہشپ یعنی سردار مذہب مقرر کرتا ہو اور جو اعزاز کے درجے سلطنت ترکی میں ہیں وہ سب ان کو عطا فرماتا ہو، عیسائی سلطانوں میں ان عیسائیوں کو جو اس چرچ کے نہیں ہیں جس چرچ کی سلطنتیں یہی مذہبی آزادی نہیں ہر جیسی کہ سلطان کی عمل داری میں تمام عیسائیوں کو خواہ کسی چرچ کے ہوں حاصل ہو، اس وقت جو لڑائی یونان اور ترکی میں ہو رہی ہو تمام عیسائی سلطنتیں خاموش ہیں اور کسی سلطنت نے یونان کی مدد نہیں کی اور کچھ شبہ نہیں کہ آخر کو عیسائی سلطنتوں کو جو ترکی کے ارد گرد ہیں بیچ بچاؤ کے کرنے اور صلح کے ہو جانے میں بالائتفاق دست اندازی کرنی پڑے اور معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا ہو ترکی کے مفید یا یونانیوں کے مفید مگر اس کی بنا پوٹیکل امور پر مبنی ہوگی نہ مذہبی امور پر، پس نہایت فحش ہو کہ مسلمان یا عیسائی ان ملکی فسادوں کو مذہبی لباس پہنا کر لوگوں کو مشتعل اور برا بیگنہ کر دیں جس سے سراسر لوگوں کا نقصان ہو جو ایسی باتوں سے مشتعل ہوں اور ملکی امور کو مذہبی لباس پہنا کر مذہب مذہب پکاریں اور ایسا کرنے سے بجز اس کے کہ ان کی حماقت سے انھیں کے اہل مذہب کا کچھ نہ کچھ نقصان ہو اور کچھ نتیجہ نہیں

اگرچہ کچھ شک نہیں کہ مڑکی ایک مسلمانی سلطنت ہو اگر اس کو واجب خواہ نا واجب کچھ نقصان پہنچے تو یہ ایک قدرتی امر ہو کہ ہم مسلمانوں کو دلی رنج ہوگا اور یہ بات ترکی پر ہی موقوف نہیں ہے اگر ایران کی سلطنت کو مراکو کی سلطنت کو افغانوں کی سلطنت کو اٹھنی کی نادانی اور حماقت اور بد نظمی سے کچھ نقصان پہنچے تو بھی ہم مسلمانوں کو قدرتی رنج ہوگا اور یہی حال تمام قوموں کا ہو کہ اپنی اپنی قومی سلطنت کے زوال یا نقصان سے رنج ہوتا ہو پس اس سے زیادہ ان واقعات کو وقعت دینا اور مذہبی لباس پہنانا محض بے جا اور نا واجب ہے، مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے یہ لحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہو بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہو اور انھیں مومن اخوة کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بنانا ہو اس لیے وہ ہر ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں اور اس کی خوشی سے خوش اور اس کے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں اور اس لیے ہم کو اگر خدا نخواستہ ترکوں کو نقصان پہنچے تو مثل قومی نقصان کے رنج ہوگا وہ نقصان کسی پولیکل سبب سے ہی ہو۔

(۲) دوسرا مضمون بھی تاریخی ہے جس میں "خلیفہ" اور "امیر المؤمنین" کے القاب پر تاریخی بحث کے بعد لکھا ہو کہ "پس خلافت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا وافی ملک یا امیر وغیرہ قرار پا سکتے ہیں اور جو مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو ان خلفاء سے تھا جو زمانہ میں برس بعد وراثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئے وہ ان حاکموں سے نہیں ہو سکتا جو بعد میں ہوں مذکور کے ہوئے خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں یا سلطان یا امیر جو کچھ چاہیں پس کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو بجز ایک مسلمان حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے نہ اس کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر سکتے ہیں نہ اسے شک اسلامی اتحاد اس کے ساتھ رکھتے ہیں اس کی بھلائی اور بہتری سے خوش اور اس

کی برائی اور ذلت سے ننگیں ہوتے ہیں۔

سلطان ترکی کی اس فتح سے جو اس وقت یونانیوں پر حاصل ہوئی ہو سبب اس اتحاد قومی کے جو اسلام نے مسلمانوں پر قائم کیا ہو مسلمان ہنایت نوش ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ترکوں کی شکست ہوتی تو ہم کو اسی اتحاد کے سبب ضرور رنج ہوتا اور یہ ایک امر انسان کا طبعی ہو جس سے انکار نہیں ہو سکتا، یونانی ہمارے حاکم نہیں ہم ان کی رعیت نہیں، پس ہم کو یہ کہنے میں کہ خوب ہو کہ یونانیوں نے شکست پائی اور ذلیل ہوئے اور خدا کا شکر ہو کہ ترکوں نے فتح پائی کیا تامل ہو ہم کو ہرگز نہیں معلوم ہو کہ گورنمنٹ انگریزی کی جس کے امن میں یہ طور رعیت ہم مسلمان رہتے ہیں اس لڑائی میں جو ترکوں اور یونانیوں سے ہوئی کیا پالیسی ہو اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو ہم کو اس پر یقین نہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگ وہ بات کہتے ہیں کہ ان کو درحقیقت معلوم نہیں اور اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو تب بھی اڑھائے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کا ہو اس سے ہم کسی طرح ٹیکہ دوش نہیں ہو سکتے اور ایسی حالت میں بھی ہمارا فرض ہو کہ اپنی گورنمنٹ کے مطیع فرماں بردار اور وفادار رہیں بہت سے بہت اگر کچھ کر سکتے ہیں تو یہ ہے کہ خدا سے دعا کریں کہ برٹش گورنمنٹ اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں خواہ ترکی کی ہو یا ایران یا افغانستان کی یا کسی اور دور دراز ملک کی دوستی و ارتباط ہو اور کبھی مخالفت پیدا نہ ہو۔

(۳) تیسرے مضمون میں "ترکوں کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی ہم دردی" (جس میں مصنف کے نزدیک تیرہویں تیر ہیں) پہلے انھوں نے یہ تنبیہ کی کہ "ترکوں کی فتح یابی کو اسلام کی فتح یابی سے پکارنا اسلام کی قدر و منزلت کے خلاف ہو اور اسلام کے معزز نام کو جس نے اصلی فتح پائی ہو اور جو ہمیشہ فتح مند رہے گا ایسے امور دنیاوی

میں شریک کرنا جو دنیوی اسباب پر مبنی ہیں کہل نا سمجھی کی بات ہے۔ اس کے بعد لکھا کہ
 ”ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ میں فتح پا بہوئی
 اور برباد نہیں ہوئی، لیکن اس کو ایک اسلامی لباس پہنانا اور اسلام کی
 فتح اسلام کی فتح پکارنا اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہو تو اور کیا ہو اور یہ
 فتح ایسی کون سی فتح ہو جس پر اتنا شور و غل مچایا جائے۔ ہر شخص جانتا ہو کہ
 ترکوں کے آگے یونانیوں کی کچھ حقیقت نہیں ہو اور اگر وہ مقابلہ کریں گے
 تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہو اسی طرح ترک یونانیوں کو مار لیں گے
 اندیشہ اگر تھا تو یہ تھا کہ یونانیوں کو ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت کیوں
 ہوئی اور اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ درپردہ کوئی بڑی قوی سلطنت
 یونانیوں کی مدد پر ہو اس شبہ کو مسٹر گلیڈ اسٹون کی نامعقول اسپچوں اور
 تحریروں نے اور لندن کے ریڈیکل مجنوں کی اسپچوں اور ٹیلیگراموں
 نے زیادہ قوی کر دیا تھا مگر ہر سمجھدار سمجھ سکتا تھا کہ نہ مسٹر گلیڈ اسٹون گورنمنٹ
 پر ہیں اور نہ ان قلیل ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ کا گورنمنٹ پر کچھ اثر پڑ سکتا ہو
 پس یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو
 ہنایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی، جب لڑائی کا معاملہ گرم ہوا تو کسی
 بڑی سلطنت نے یونانیوں کا ساتھ نہیں دیا اور اس سے ظاہر ہو گیا کہ
 نہ گورنمنٹ انگریزی یونانیوں کی مدد کا رتھی نہ فرانس نہ جرمن نہ اور کوئی
 گورنمنٹ، اب آئندہ جو کچھ ہو اُس کی بنا پر لیگل مصلحتوں پر ہوگی نہ اسلام
 کی مخالفت پر، ہندستان کے مسلمانوں کو جو اس معاملے میں جوش و خروش
 ہوا ہماری دانست میں صرف انگریزی اخبارات کا باعث ہوئے ہیں
 مسٹر گلیڈ اسٹون نے اور انگریزی اخباروں نے کوئی درجہ اہمیت و عظمت اسلامی

کامسلطان کی نسبت نہیں چھوڑا تھا اور کوئی بدی اور بُرائی ایسی نہ تھی جو انہوں نے ترکوں کی نسبت نہ لگائی ہو اور یہ سب باتیں خاص کر ترکوں اور عام طور پر سب مسلمانوں کو نہایت رنج و درخست رنج دہ تھیں مگر سب ترکوں کی فتح ہوئی تو انہوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا رحم نہ کیا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا مثلاً جب یونانیوں کے ایک گروہ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا تو ترکوں نے اپنے پاس سے ان کو کھانے کو دیا یونانیوں کے مجردوں کی تیار داری کی اور نہایت ہر بائی۔ سے ان کے ساتھ برتاؤ کیا اب ترکوں کی فتح ہونے کے بعد اس رخ کے مقابلے میں مسلمان ہندو نے مدارِ اعتدال سے زیادہ خوشی ظاہر کی اور گو فرزند انگریزی نہایت خاموشی سے ان سب باتوں کو دیکھتی رہی ہم بھی اس خوشی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے مگر یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمان ہندوستان میں انگریزوں کو رنڈ کی رعایا میں مگر اسس کو پہولنا نہیں چاہتے کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے جو گورنٹ کے خلاف ہو پس ہم کو لازم ہے کہ وہی کریں جو گورنٹ کے مرضی کے برخلاف ہو

(۴) جو سمجھے مضمون "سلطان اور ہندوستان کے مسلمان" کی بنیاد یہ تھی کہ اسی عنوان کے نیچے قسطنطنیہ کا ایک نامور خط، ۱۷۵۷ء چھپا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "جو جواب سلطان نے ہندستان کے مسلمانوں کی مبارک بادوں کا ارسال فرمایا، جو انہوں نے یونان پر ترک کی فتوحات کی نسبت سلطان ممدوح کی خدمت میں بھیجی تھیں وہ ایک طولانی چھٹی میں درج ہو جس میں ضمیمہ کی نسبت تمام سچے مسلمانوں کے خرائض بیان کیے گئے ہیں جن میں نقصانات نقدی اور اخلاقی اور جسمانی شامل ہیں۔ چھٹی مذکورہ کے خاتمے پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی قوت اتفاق اور یک جہتی پر نصرت ہے۔ یہ چھٹی خاص ایچیوں کی معرفت ہندوستان اور مصر اور عرب کے شیوخ اور علما کے پاس بھیجی جائے گی۔" سرسید نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ یہ اسلما

انٹرنیشنل لا کے مطابق صحیح نہیں معلوم ہوتی اور پھر یہ دکھایا کہ سلطان نے مبارک باد لیا کہ جو خواب بھیجے وہ اپنے سفر کے پاس بھیجے تھے اور پھر جب کہ ہندستان کے سلطان سلطان ٹرکی کی رعایا نہیں ہیں تو ہندستان کے مسلمانوں کو غلیفہ کی نسبت کیا فرائض بیان ہو سکتے ہیں کیوں کہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے بجز اس کے کہ وہ جس سلطنت کی حکومت میں بطور رعایا کے رہتے ہیں اس کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کچھ فرض نہیں ہو۔ پھر انہوں نے یہ مطلب لیا کہ ”اگر ایسی جگہ میں نقصانات کوئی مطالب ہو تو وہ معمر اور عرصے متعلق ہوگا جو سلطان کی رعیت ہیں یا یہ کہ ان ممالک سے جو تہذیب نامے گئے تھے ان کے خواب میں سلطان نے کوئی چھٹی کبھی ہوگی اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ ”سلطان نے جو لوہا نیوں پر پختہ پائی اس سے کوئی ادسا مسلمان نہ ہوگا جس کا دل خوش نہ ہوا ہو ہم بھی کہتے ہیں کہ سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا ہے لیکن جو کچھ ہندستان کے مسلمانوں نے کیا بلا اجازت اور مرضی گو رمنٹ کے ہم اس کو چھپا نہیں سمجھتے گو گو رمنٹ نے اس پر کچھ اتنا نہیں کیا مگر جن مسلمانوں کو ایسا کرنا تھا ہمارے نزدیک ضرور تھا کہ اولاً گو رمنٹ سے اس کی اجازت حاصل کرنے اور اس کے بعد جو کچھ ان کو کرنا تھا کرنے۔ ہم ہرگز اس بات کو اپنے نہیں کرتے کہ ایسے پولیسکل امور میں جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں بلا اجازت اور مرضی گو رمنٹ ہندستان کے مسلمان کوئی کارروائی کریں کیوں کہ ہمارا قانونی اور مذہبی فرض یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی گو رمنٹ کے وفادار اور اس کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہیں اور یہ بات تو کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ دکن کے ہندوؤں نے کس خیال سے سلطان کو اس فتح کی بابت مبارک باد بھیجی کیا وہ بھی ان فرائض میں داخل ہونا چاہتے ہیں جو سلطان مسلمانوں کی نسبت قرار دے۔

آخر کو ہم پھر بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا ٹیلیگرام یا تو غلط ہو یا اس میں

مسلمانان ہندستان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔
 ”جبکہ ترکوں نے سپاسا پول کی لڑائی میں رؤسیدوں پر فتح پائی تھی اس وقت
 مسلمانان ہند نے کوئی علامت ایسی خوشی کی، ظاہر نہیں کی تھی جیسے کہ یونانیوں پر
 فتح پانے پر ظاہر کی ہے۔“

سپاسا پول کی لڑائی میں خود انگریزی گورنمنٹ نے ترکوں کے لیے ہندستان
 میں چندہ کرنے کی اجازت دی تھی لیکن اگر ہماری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو تو اس وقت
 بھی ترکوں کے لیے کوئی معتد بہ چندہ ہندستان میں نہیں ہوا تھا۔

”پس یہ بات غور کرنے کی ہے کہ یونان پر فتح پانے میں ہندستان کے مسلمانوں
 نے کیوں ایسی گرم جوشی ظاہر کی۔“

”ہماری رائے میں اس کے دو سبب ہیں اول یہ کہ یورپ کے بعض لوگوں
 کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو کوئی بہت بڑا تعلق سلطان ترکی
 سے نہیں ہو پس مسلمانان ہندستان نے علی کارروائی سے ظاہر کیا کہ ان کو سلطان
 ترکی سے جو حریم شریفین کا محافظہ اور خاص قسم کا تعلق ہے قطع نظر اس سے کہ سلطان
 خلیفہ ہی یا نہیں اور مسلمانوں کو اس سے احکام کا تسلیم کرنا لازم ہو یا نہیں؟ دوسرے
 یہ کہ مسٹر گلڈ سن اور دیگر ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ نے نہایت سخت اور جھڑ بے جا
 اور ناداجب زبان درازی سلطان ترکی اور ترکوں کی نسبت کی جس سے مسلمانان ہند
 کے دل نہایت رنجیدہ تھے جب کہ ترکوں کو یونانیوں پر فتح ہوئی تو جس قدر
 زبان درازی سے مسلمانوں کو رنج ہوا اسی قدر ان کو خوشی کرنے کا موقع ملا۔
 مگر اس خوشی کو کسی پولٹیکل امور پر محمول کرنا ہماری رائے میں بے جا ہے اور اس سے
 زیادہ اور کوئی امر ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔“

پانچویں مضمون (ترکوں کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی ہم دردی)

۱۸۵۵ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں روس اور ترکی لڑائی میں انگریزوں نے جس طرح روس کے ہاتھوں سے ترکی کو بچایا اس کو بیان کر کے یہ سوال کیا ہو کہ پس اب یہ سوال ہو کہ ایسی ہم دردی جو انگلستان کی طرف سے ترکوں کی نسبت ظاہر ہوئی ہندستان کے مسلمانوں نے اس کا شکریہ کیوں نہیں ادا کیا۔

”ادہم پاشا نے یونانیوں کی حال کی لڑائی میں اس سے زیادہ بہادری اور دلاوری نہیں دکھائی جس قدر کہ عثمان پاشا نے پلونایں دکھائی تھی پس کس وجہ سے ہندستان کے مسلمانوں نے ادہم پاشا کا بہت شکر کیا اور عثمان پاشا کی نسبت کچھ نہیں کیا ہمارے پاس اس کا کچھ جواب نہیں ہو ہمارے نزدیک جو کچھ اس وقت مسلمانوں نے کیا وہ صرف ان کی ایک خفیف الحزنتی تھی اور ایک کے دیکھا دیکھی اوروں نے بھی وہی کیا جو انھوں نے کیا تھا۔

جو لوگ اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو یونان کی فتح پر اس قدر خوشی منائی وہ کسی پولٹیکل امر پر مبنی تھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہو اور بحر خفیف الحزنتی کے اور کوئی امر نہیں ہو۔ سلطان کو خلیفہ ماننا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو جس طرح کہ بنی امیہ اور بنی عباس کو خلیفہ کہا جاتا ہو کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو جو سلطان ہزکی کے احکام کو مثل احکام پوپ کے واجب التعمیل سمجھتا ہو یا مثل احکام خلفا راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے جانتا ہو۔ پس کسی طرح پر خیال نہیں ہو سکتا کہ ان کا خوشی منانا اور مبارک باد کے تار بھیجنا کسی پولٹیکل امر پر مبنی ہو گو کہ ہمارے نزدیک ان کا ایسا کرنا بھی بلا اجازت گورنمنٹ کے جس کے کہ وہ رعیت ہیں ہرگز مناسب نہیں تھا۔“

ان اقتباسات سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ترکی معاملات میں سرسید کی رائے کیا تھی اور ترکوں سے ان کو محبت تھی یا نفرت۔ اور ان کی فتویٰ کی خوشی کو انھوں نے

نے جذباتی آدمی کی نظر سے دیکھا یا ایک دو بین باہر ریاست کی آنکھوں سے، اور آیا ان کے مضامین تیر تھے یا حقیقت پر مبنی۔ مسئلہ ۱۸۱۷ء کی جنگ عظیم کے بعد جب مسلمانان ہند نے مسابہ خلافت کو جوش و خروش کے ساتھ اٹھایا، تو ان کو سب سے بڑی تائید سر تقیو ڈومارین سابق پروفیسر و پرنسپل علی گڑھ کالج سے ملی جو سر سید کے تربیت یافتہ تھے، دس سال تک انڈیا کونسل کے بھی رکن رہے تھے اور انھوں نے اہم جنگی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ سر تقیو ڈومارین نے سنہ ۱۹۱۹ء میں جب کہ مسلمانوں کی جانب سے لندن میں میمورنڈم اور عرضداشتیں پیش ہو رہی تھیں، کمٹ کے لیے ایک تہنہ آمیز مضمون شائع کیا تھا جس میں مسلمانوں کے احساسات جذبات کی زبردست ترجمانی کی تھی اور اپنے سنی سالہ تجربات کا پچوڑ پیش کیا تھا اس مضمون میں انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ ”ایک عظیم الشان مسلمان نے ریح صدیقی تہل مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری حالت یہودیوں کی سی ہو جائے گی اور ہمارا کوئی ملک، ہمیں رہے گا۔“

اسی گفتگو کو انھوں نے ایک اور مضمون میں اس طرح دہرایا کہ ”سر سید احمد نے مجھ سے کہا کہ جب بہت سی مسلم سلطنتیں موجود تھیں تو ہمیں ان میں سے ایک سلطنت کی تباہی پر زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا لیکن اب جب کہ صرف چند سلطنتیں باقی رہ گئی ہیں ہمیں ان میں سے ایک چھوٹی سلطنت کے ضائع ہوجانے کا بھی احساس ہوتا ہے اگر ترکی کو فتح کر لیا گیا تو وہ بہت بڑا قدم ہو گا کیوں کہ وہ اسلام کی دولتِ عظمیٰ میں سے آخری دولت ہے جو باقی بچی ہے ہمیں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ہم یہودیوں کی طرح ایک ایسی قوم بن کر نہ رہ جائیں جس کا اپنا کوئی ملک بھی نہیں ہے۔“

مولانا شبلی نے بھی اسی زمانے میں ایک مضمون خلافت پر لکھا تھا جس میں مذہب

کی رو سے منصب خلافت کی حقیقت پر بحث کی غنی اور آخر میں دکھایا تھا کہ جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ خلافت صرف نبیوں پر رہے گی پھر سلطنت ہو جائے گی، اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ تیس برس کے بعد جو فرماں روا ہوئے وہ باوجود قریش ہونے کے خلیفہ نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے بہر حال تمام روایات کا قدر مشترک یہ ہے کہ خلافت کے لیے قریش ہونا ضروری ہو اور جو شخص قریش کے خاندان سے نہ ہو وہ کسی طرح تمام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق خلیفہ نہیں ہو سکتا، سلطان سلیم فاتح مصر کے برائے نام خلیفہ المتوکل کو یہ جبر قسطنطنیہ لایا اور خلافت کے لقب سے دست بردار ہونے پر اور اپنے نام پر یہ لقب منتقل کرنے پر مجبور کیا۔

مصنف حیات نبلی اس مضمون کو "آورد و حق آمد نہ ہتی" اور "نکھو ایگیا" سے تعبیر کرتے ہیں گویا سرسید کے اثر سے مولانا نے اپنے اعتقاد اپنے مذہب اور ضمیر کے خلاف احادیث میں تاویل دیا۔ کئی مگر یہ تو مسائل عام کی نظموں میں بھی خلافت کا لفظ نہیں پاتے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے پورے غور کے بعد اور اپنے ضمیر کے مطابق یہ مضمون لکھا تھا۔ پھر حشہ ۱۱۷ میں ان کا ایک سا اور مضمون ندوۃ العلماء کے کارکن الندوہ میں ہماری نظر سے گذرنا ہوا جس کا عنوان تھا "مسلمانوں کو غیر مذہب کا حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے" کیا یہ بھی سرسید کے روحانی خوف سے لکھا تھا مولانا نے کہیں اور کسی جگہ ان مضامین کے مطابق اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔

۱۸۹۷ء میں ہی سرسید پر بھی شورش تھی اور فوجی اقدامات جاری تھے اور مسلمانان ہند کے خلاف شدید پشہر تھا، دی گئی تھی کہ "ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اس کی مسلمان رعایا کے درمیان روز بروز مخالفت رُو بہ ترقی ہو" سرسید بلا وجہ مسلمانوں کی طرف سے بدگمانیوں کا پیدا ہونا قوم کے حق میں ہمیشہ مضر سمجھتے تھے اور دلیری کے ساتھ ان کے دُور کرنے میں کوشش کرتے تھے۔ ۱۸۹۷ء کے پُر شور و پُر خطر دور میں انھوں

نے مسلمانوں کے متعلق جو تحصیبات شکوک و شبہات تھے ہنایت جرات کے ساتھ ان کا ازالہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کے ایک خطرہ سمجھا گیا اور وہ بغاوت کے مُرادت قرار دی گئی تو پھر وہ میدان میں آئے اور اپنے دہلی ہونے کا اعلان کیا اس موقع پر بھی انھوں نے یہی اور لارڈ ایچن و ایسٹن دگورنر جنرل ہند نے علی گڑھ آکر اس شہرت کی غلطی کا اپنی تقریر میں اعتراف کیا۔

اس آخری حملے کے بعد پھر سرسید اور کانگریس پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلی کے ایک خط ستمبر ۱۹۴۷ء کا حوالہ دیا، پکڑے ہوئے میں ہمیشہ آزاد رہا سرسید کے ساتھ سولہ برس رہا لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالفت رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بار بار بحثیں رہیں۔“ (۲۹۷)

اس خط سے یہ تو ماننا پڑے گا کہ سفرنامہ روم و مصر و شام کی ترتیب اور مضمون خلافت وغیرہ کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا، سو وہ انھیں کا طبع زاد ہی درجہ مولانا نے آزادی لائے اور پولیٹیکل مسائل میں اختلاف کا ہوا دہا کیا جو وہ غلط ہو گا۔

اب ہم اس خط کے متعلق بھی کچھ توجہ دلائیں گے، مولانا نے فروری ۱۹۴۷ء میں ایک مسلسل مضمون ”مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ“ کے عنوان سے شائع کیا تھا، اس کی اشاعت پر ان کے بعض احباب نے اعتراض کیے کہ وہ قدیم مسلک کے مغرب ہو گئے ہیں اس کا جواب مولانا نے ایک نظم میں دیا جس کی تمہید میں ارشاد ہے

- (۱) معترض ہیں مجھ پر میرے مہربانان قدیم جرم یہ ہی میں نے کیوں چھوڑا وہ آئین کہیں
 - (۲) میں نے کیوں لکھے مضامین سیاست پذیر کیوں بذی تقلید سسر زردہ نمایان زن
 - (۳) کانگریس سے مجھ کو اہلدارِ مملکت کیوں نہیں کیوں حقوقِ ملک میں ہوں دول کا ہم سخن
- مگر مولانا کہیں یہ نہیں فرماتے کہ میں تو ہمیشہ سے ہندوؤں کا ہم سخن تھا اور آئین کہیں

کا باغی، بلکہ محترضین کو الزامی جواب دیتے ہیں کہ

(۱) خیر میں تو شامیہ اعمال سے جوہر ہیں آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن
(۲) آپ بھی توحید (سید) سے ہیں اب بخیر اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی خوشک

یہ نظم بھی ستمبر میں شائع ہوئی اور محمولہ خط (پرائیوٹ) بھی اسی جہینے کا ہو، مولانا نے جو اذہا خط میں کیا ہو اس کا ان کی علمی و علمی زندگی میں کوئی پر توہ یا جگنو کا سا چمکارا بھی نظر نہیں آتا اور یہی قیاس کیا جاسکتا ہو کہ ندوہ سے آثارِ جدائی کے بعد مولانا سائین میں داخل ہونا چاہتے تھے اور اس وقت سیاسی حالات کے مسلمانوں میں بھی ہرجان تھا اس سے فائدہ اٹھانا مقصود تھا۔ تعجب ہو کہ سرسید کی سولہ سالہ رفاقت اور کانگریس کے متعلق مولانا کی یادہ سالہ (۱۸۸۷ء تا ۱۸۹۹ء) مخالفت میں ان کے وعوے کی کوئی ایک نشانی و علامت بھی نہیں ملتی، بلکہ برعکس نظر آتی ہو البتہ مصنف نے تائید میں ایک یہ بیان پیش کیا ہو ”ایک نہایت ثقہ اور معتبر بزرگ (مولانا شیروانی) جو مولانا کے بڑے گہرے دوست، ساتھ ہی سرسید کی تحریک کے پڑانے حامی اور اس کی جلوت و جلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں مولانا کے اوراقِ حیات کے ایک مسودہ پر جس میں مولانا کی دل برداشتگی کی تفصیلات تھیں اپنے قلم سے یہ ارقام فرمایا کہ ”دل برداشتگی کی وجہ سیاسی آراء کا اختلاف بھی تھا مولوی شبلی اس جدید تحریک کے حامی ہو چکے تھے“ (۲۹۸) اس کے بعد ہی مصنف کا ایک فقرہ یہ بھی ہو کہ ”اس سلسلے کی نئی کڑی ندوۃ العلماء کی شرکت کا سبب بن گئی یہ مجلس اس زور و شور سے اٹھی تھی کہ حکام کو خیال ہو گیا کہ اس سے مسلمانوں میں بغاوت پھیل جائے گی بعض غرض مندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کو یہ رنگ دے کر فٹنٹ گورنمنٹ تک پہنچایا اور فٹنٹ گورنمنٹ نے بھی مولانا کا علی گڑھ میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔“

۱۔ مضمون الندوہ ”مسلمانوں کو غیر مذہب کی حکومت میں کیوں کر رہنا چاہیے۔“

ایڈیٹر: تقریب سنگ بنیاد دارالعلوم ندوۃ العلماء

مولانا شیردانی کی ثقافت اور اعتبار مسلم مگر یہ کیوں کر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ سرسید کی تحریک کے جلوت و خلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں۔ اسی گڑھ یا سرسید کی تحریک کے اثر سے تو ان کو بتنا بچا گیا کہ انگریزی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل کرنے کے بجائے ان کو آگرہ کالج میں بھیجا گیا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں ٹائیٹل کے نیروانی رد سامنے اس تحریک کی مدد کی دباں ایک حصے نے مخالفت میں بھی زبردست حصہ لیا اور سرسید نے اپنی رپوٹوں میں بھی اس کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ضلع یا پڑوس کے اضلاع مثل بلنہشہر یا ایٹھ کے کسی مسلمان رئیس نے اپنے بیٹے کو اس کالج میں داخل نہیں کیا ان اضلاع کے رئیسوں نے اب تک اس پاکیزہ اور شیریں پانی کی نہر سے جو ان کے گھروں کے پاس بہ رہی ہے اور دور دراز کے آنے والوں کو فیض پہنچا رہی ہے پانی پینے پر پیا۔ یہ رہنے کو ترجیح دی ہے۔ (۱۸۶۸ء)۔ ہمارے ضلع کے روسایں سے بھی کم پور کے رئیسوں نے بہ استثناء محمد عنایت اللہ خاں صاحب ہمارے کالج کی طرف کچھ توجہ نہیں کی (۱۸۶۲ء) ان نشتہ بزرگ کے علم محترم رئیس بھی کم پور سے نکلا اس تحریک سے کنارہ کش رہی رہے البتہ جب یہ بزرگ خود بالغ نظر ہوئے تو اول مرتبہ ان کا امام کافرنس کے عام ممبروں کی فہرست میں نظر آیا لیکن انہوں نے غریبے تک کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ اسی طرح ۱۸۶۷ء میں ڈیفنس ایسوسی ایشن کی فہرست ارکان میں ان کا نام نظر آتا ہے جو ایک سیاسی انجمن تھی ۱۸۶۷ء میں سرسید نے اور فوجیوں کے ساتھ ان کو بھی زمرہ شریکان میں داخل کر لیا اس طرح ۱۸۶۷ء سے وابستہ تحریک ہوئے اور یہ سرسید کا آخری سال زندگی تھا اس لیے جلوت و خلوت نے اسرار کی ہوا بھی ان نشتہ بزرگ کو نہیں لگی۔ مولانا ششی کی جدید تحریک کی حمایت اور سیاسی آراء سے دل برداشتگی پر بھی غور کرنا چاہیے کانگریس تحریک ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئی ۱۸۸۵ء

میں سرسید نے مخالفانہ تحریک اٹھائی۔ ۱۸۵۹ء تک دس سال اور آٹھ سال گزر چکے تھے اور یہ تحریکیں پُرانی ہو چکی تھیں مگر مولانا کی کوئی حمایت و دل برداشتگی کا رشتہ بھی نہیں پایا جاتا بلکہ ۱۸۵۹ء میں شمس العلماء کے خطاب پر تو مولانا نے جو تقریر کی تھی اس سے دلی وابستگی ہی پائی جاتی تھی اور کالج سے قطع تعلق کے بعد بھی کالج ہی میں رہنے کا دلولہ نظر آتا ہے۔

اب اس سلسلے کی نئی کڑی کو دیکھیے جو ایک خط سے تیار کی گئی ہے اور مصنف نے صرف حاشیہ پر ایک حوالہ ”مکاتیب شبلی بہ نام مولانا شیردانی (۱۴۱) کافی تصور کیا ہے اس نئی کڑی سے یہ رشتہ پیدا کیا گیا کہ علی گڑھ سے علیحدگی میں فنڈنگ گورنرز کا بھی دخل تھا کیوں کہ ندوہ بنادوت کا منہج تصور کیا گیا، لیکن سلسلہ واقعات پر غور کرنے سے یہ کڑی ٹھیک نہیں ملتی، ندوہ کی تحریک ۱۸۵۹ء میں اٹھی علی گڑھ سے زبردست تائید ہوئی اور مسلسل اس کے اجلاس ہوتے رہے، مصنف نے صفحہ ۲۵۱ پر حکومت کی بدگمانی کا زمانہ ۱۸۵۹ء و ۱۸۶۰ء متعین کیا ہے، یعنی ۱۸۵۹ء تک کوئی بدگمانی نہ تھی اور مولانا سرسید کی رحلت (۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء) کے ایک ماہ بعد ممیٰ میں پھر جنینہ کی رحلت لے کر گئے اور اس زمانے کے بعد معنی ہو گئے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳۲) مصنف نے بدگمانی کا جو زمانہ متعین کیا ہے مولانا اس وقت حیدرآباد میں (۲۲ مئی ۱۸۵۹ء) ناظم سررشتہ علوم و فنون مقرر ہو چکے تھے۔ اس لیے علیحدگی میں فنڈنگ گورنرز کا باقہ کیوں کر شامل ہو سکتا ہے۔ جس خط پر یہ فقرہ محمول کیا وہ ۲۴ اگست ۱۸۵۹ء کا ہے جب کہ حکم ران مسعود کا دور بدلنے ہی بدگمانی کے بادل چھٹ چکے تھے خط کا مضمون یہ ہے:

”اس ہفتے میں نواب محسن الملک کا خط آیا کہ وہ نواب افندنگ گورنرز سے اور عہدیم ہوا کہ نہایت صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کوٹھوک تھے برقرار کر دیے

اور یہ بھی سمجھا کہ اب اُن کو علی گڑھ کالج اگر بلانا چاہیے تو بلا سکتا ہے، مگر عین الملک نے
 مجھ کو اس اطلاع کے بعد لکھا کہ کالج میں آجائے وظیفہ حیدر آباد بھی جاری ہو جائے گا
 اور سو رپیہ کالج سے بھی ملیں گے لیکن میں نے منظر نہیں کیا اور کوشش میں تھا
 اور یہوں کہ وظیفہ جاری ہو جائے تو ندوہ میں آجائوں۔ اس حوالے سے بھی اس
 نئی کڑی کا کوئی سلسلہ نہیں ملتا، اس خط کے ۱۴ دن بعد دوسرے خط نمبر ۴۴ مورخہ
 ۶ ستمبر میں لکھتے ہیں کہ ابھی ابھی نواب عین الملک کا خط آیا کہ فٹنٹ گورنر حال نے
 میرے متعلق فیصلہ کر دیا اور رائے دی کہ چاہو تو علی گڑھ اُن کو بلاؤ، اس صورت میں
 مالی فائدہ بھی ہو اور شہرت بھی، باوجود اس کے اگر ندوہ میں آنا چاہتا ہوں تو اس میں
 کیا خود غرضی ہو سکتی ہے۔

یہ بھی دیکھیے کہ ان دونوں خطوں میں کس قدر تباہی ہو ۲۴ اگست کو لکھتے ہیں
 کہ اس مفتے میں عین الملک کا خط آیا اور جواب دے دیا، پھر ۶ ستمبر کو ابھی ابھی
 دوسرا خط کیسا اور پھر علی گڑھ میں مالی فائدہ ہم سے بالاتر ہو، اس وقت مولانا کو
 چار سو روپیہ (حالی) ماہانہ ملتا تھا اور اگرچہ وظیفہ ملازمت کے باعث مسدود تھا
 مگر ترقی کی امید بھی تھی مگر عین الملک سو روپیہ مانا نہ پیش کرتے ہیں اور وظیفہ کے ساتھ
 یہ رقم دو سو روپی ہو جاتی ہے پھر بھی بحساب سکہ کلمہ ڈیرہ سو روپی کا نقصان رہتا ہے۔
 یہ مالی فائدہ کہاں سے آگیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون ہی طبع زاد ہے۔

مولانا شیل کالج کے ایک پروفیسر تھے ان کے اختلاف سے سرسید کو کٹ بڑھتا
 ہونا چاہیے تھا نہ کہ مولانا کو، نیز مسٹر میک جو ان کے بلا دستا فسر اور بقول بعض
 سرسید کے سیاسی شیر تھے اگر بے زاد ہو جاتے تو بجا تھا کیوں کہ مولانا کی سیاسی
 راؤں سے طلباء کے مسائل بھرنے کا امکان تھا، لیکن ہم تو ۱۸۹۶ء میں جب کہ مولانا

۱۔ اس دوسرے خط کا حوالہ جانشیل میں نہیں ہے۔

طویل شخصیت کی فکر میں ہیں ان دونوں کو اس بات پر متصر پاتے ہیں کہ وہ چھ ماہ کالج میں گزاریں، اور یہ ایک دوسرا ثبوت اس امر کا ہے کہ سلسلے کی نئی گڑی انتہائی بوری نہ مولانا کی سیاسی آرا کے اختلاف سے دل برداشتگی اور جدید تحریک کی حمایت بھی ایک عجیب و غریب سمت ہے، وہ سرسید کی رحلت کے بعد جب کہ ان کی سیاست ختم ہو چکی تھی کالج سے مستعفی ہوتے ہیں لیکن جدید تحریک کی حمایت میں قلم و قدم نہیں اٹھاتے حالانکہ حیدر آباد سے تعلق پیدا ہونے تک وہ آزاد تھے پھر اس تعلق کے ختم ہونے کے بعد وہ ندوہ میں آجاتے ہیں جہاں اگرچہ سیاست "منجر ممنوعہ" تھی لیکن مولانا پھر بھی آزاد تھے تاہم اس دورِ آزادی میں بھی ان کی حمایت کانگریس معممہ بنی رہی اس لیے یہ سب دعویٰ اور بیان مہلات سے زیادہ وقیع نہیں اور مولانا شیر والی کا بیان محض تفسیہ پر کھرا نہیں اترتا، محض ثقاہت دلیل صداقت نہیں ہوتی۔

یہ امر اور ناقابلِ فہم ہے کہ علی گڑھ کی سیاست کو مولانا کو گھٹن ہونے لگی بیک صاحب کی سیاست سے وہ بے زار تھے جس کا مقصد کالج کو غلامی و وفاداری کا سبق تھا مگر ندوہ میں آنے کے لیے بے قرار تھے جہاں گورنمنٹ انگریزی کی وفاداری وغیرہ خواہی بطور ایک مذہبی فرض کے تھی جس کا ارکان ندوہ نے ہمیشہ اعلان بھی کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ شہرت کے لحاظ سے تو بڑا میدان تھا مگر مالی منافع بہت کم تھے اور مولانا شبلی اب اس تنخواہ میں جو ملتی تھی پابندی کے ساتھ بسر نہیں کر سکتے تھے اخراجات کا بار تھا دوسرا عقد بھی کر چکے تھے اور خانگی حالات بھی کچھ ایسے ہی مقتضی تھے کہ وہ زیادہ نفع کی راہ تلاش کریں اس لیے مولانا نے حیدر آباد کا رخ کیا تھا مگر سرسید کی زندگی میں وہ کالج چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے اس لیے پھر واپس آگئے اور جب سرسید کا انتقال ہو گیا تو حیدر آباد چلے گئے۔ جہاں معتول منشا ہر ہفتہ تھا اور جب تک حالات سازگار رہے ملازمت کی۔

۱۳۔ کالج سے رخصت لینے کی تجویز کے عنوان میں لکھتے ہیں کہ ”کئی برس سے ہوئی انوفت

اور کثرتِ دعا غنی محنت کے سبب مولانا کا معدہ صبح نہیں رہا تھا ۶ مارچ ۱۹۵۶ء کو لکھتے ہیں کہ میں دو ایک مہینے سے بالکل بے کار رہتا ہوں دانش سے کچھ کام نہیں ہو سکتا اب کی انشاء اللہ مکان پر نہایت مستعدی سے علاج کراؤں گا میری خواہش ہے کہ تمام تعطیل اعظم گڑھ میں بسر کروں بددل دوتہ دن سے زیادہ نہ ہوں۔ اس کے بعد سید محمود کے سو مزاج اور مولانا کی یکسوئی میں خلل اندازی کو بیان کرتے ہوئے تحریر ہے کہ انھوں نے مولانا پر عدمِ یافت کا الزام قائم کیا امدان سے بعض درجے چھین لیے اور بھی ان کے اس ہنر کو عیب پھرایا کہ یہ دنیا کے سبق اپنے سننِ تشریف سے اس قدر دل چسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں“ (صفحہ ۳۱۹)

اب ایک تیسرا سبب بیان کرتے ہیں کہ ”مولانا کی پریشانی کی تیسری چیمبر بیگ صاحب کی سیاست تھی انھوں نے ایک مسلم لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور پردے کے چھپے سے سیاست کی کٹ پتلیوں کو حرکت دیا کرتے تھے مولانا ان کے طرزِ سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دل چسپ دل پذیر مہین پڑھا تھا سخت ناپسند فرماتے تھے اب ارشاد ہے کہ ”اسی زمانے میں ایک بار دیوانِ حافظ کھول کر قائل دیکھی کہ کالج کی قید سے مجھے کب رہائی نصیب ہوگی، خواجہ حافظ نے جواب دیا کہ ۶۰ وقت ان سب کے پیر وہ کنی زنداں را، مولانا نے خواجہ صاحب کی اس نصیحت پر عمل کیا اور ایک سال کے لیے اس قید خانے سے رہائی کا درخواست دی۔ یعنی دسمبر ۱۹۵۶ء سے نومبر ۱۹۵۷ء تک کی رخصت لی اور اعظم گڑھ چلے آئے مگر وہاں آکر ان کا جی نہ لگا ضروری طور پر

میں پھر وہ علی گڑھ گئے لیکن پھر واپس آ گئے اور جون جولائی اور اگست ۱۸۹۷ء عظیم گڑھ
 میں گزرا۔ اور اگست بھر یہیں رہ کر نومبر ۱۸۹۷ء میں علی گڑھ واپس چلے گئے
 اور یہ کوشش شروع کی کہ ان کو کالج سے کافی طویل رخصت مل جائے (صفحہ ۳۲
 و ۳۲۱) اسی ۱۸۹۷ء کے سال کو صفحہ ۵۸۷ پر یوں دکھایا کہ ”۱۸۹۷ء میں
 رڈم ویونان کی جنگ جب پیش آئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطہ نگاہ
 سب کو معلوم ہو گیا مولانا نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا لیکن ان کو علی گڑھ
 کی فضا میں اندر سے گھٹن ہونے لگی اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی کش مکش کا علاحدگی تھا۔
 اب تک مولانا کو ۱۴ سال علی گڑھ میں گزر چکے تھے اور وہاں کی آب و ہوا کی
 کبھی کوئی شکایت نظر نہیں آئی گریں ۱۸۹۷ء میں مصنف حیات شبلی نے پیدا کر دی
 عمال کہ خط میں مولانا دو ایک مہینے سے ناسازی طبع کی شکایت فرماتے ہیں۔
 سید محمود کا مزاج بلاشبہ آخر ۱۸۹۷ء میں بگڑ چلا تھا لیکن جی سے سبک دینی
 کے بعد ان کے متعدد مفید اور علمی پہلو نظر آتے ہیں ۱۸۹۷ء میں سدا سالہ تادم تعلیم
 پرنٹنگ پریس ۱۸۹۷ء میں ندوہ کی تائید میں معرکہ الآء تقریر جس نے جدید تعلیم یا نہ طبع کے
 ندوہ کے ساتھ دل سپی پیدا کر دی ۱۸۹۷ء میں ان کی یہ تحریک کہ برانگریزی داں
 مسلمان اپنے مذاق کی کتاب انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرے یا انگریزی کتابوں
 سے مانوڈ کر کے کوئی کتاب تالیف کرے نہایت اہم تھی انھوں نے خود بھی اس پر
 عمل کیا اور قانون شہادت پر ایک شرح لکھی۔ ابلاس میرٹھ منعقدہ ۱۸۹۷ء میں وہ
 کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری مقرر کیے گئے، اور اسی سال انھوں نے ”لہاؤن
 کی طرف سے لیجن لیٹو کونسلوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ میں انتخاب پر ایک ممبر بادشاہت
 تحریر کی اور صوبہ کونسل میں ممبر بھی مقرر ہوئے اور مولانا سے یاکسی اور پروفیسر
 سے درجہ چھین لینے کا اختیار بھی نہ رکھتے تھے، تمام تعلیمی انتظام پر پریس کے ساتھ

میں تھا مولانا شبلی عربی و فارسی کے پروفیسر تھے دینیات کے اسباق کا ان سے تعلق نہ تھا اور نہ مولانا نے کسی خط میں سید محمود کی کوئی ایسی شکایت کی ہے اگر ان سے درجہ چھینے جاتے یا ان پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا جاتا تو مولانا کی خود داری کا تقاضا یہ تھا کہ فوراً استعفیٰ دے دیتے اور ایسی صورت میں کہ حیدرآباد سے کالج کی مساوی تنخواہ کا وظیفہ مقرر ہو چکا تھا رخصت اور طویل رخصت تو بے معنی بات ہو، جس کی ضرورت ہی نہ تھی باوجودیکہ مولانا بیک صاحب کی سیاست سے پریشان تھے اور سخت ناپسند کرتے تھے اور علی گڑھ کی فضا میں اندر سے گھٹن تھی لیکن ۱۸۸۹ء تا ۱۸۹۶ء تحمل و برداشت کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جاتی نہ کسی تحریر میں کوئی شاعر نظر آتی ہے ۱۸۹۶ء کی جنگ روم و یونان کے زمانے میں ہی

مولانا نے مسئلہ خلافت پر ایک عقائد مقالہ علی گڑھ میگزین میں شائع کیا تھا، پھر اس سال جو رخصت کا زمانہ ہو مولانا کیوں بار بار گھٹنے اور پریشان ہونے کو علی گڑھ جاتے ہیں ”پدلہ و دوکر دین زندان“ کی نصیحت پر صرف ایک سال کی رہائی کی خواہش کس قدر ہمل بات ہے اور یک سالہ طویل مدت رخصت کی نسبت مولانا کا حسب ذیل بیان پوری شاعر ڈالتا ہے کہ مصنف حیات شبلی نے جو وجوہ ظاہر کیے سب غلط ہیں۔۔۔

”برادرم، تمہارے اجمالی کارڈ کا میں نے جواب لکھ دیا تھا کہ وہ سب

خبریں صحیح ہیں، کیوں کہ میں یہ جانتا تھا کہ وہاں صحیح خبریں پہنچی ہوں گی لیکن

اب معلوم ہوا کہ بعض جگہ غلط خبریں مشہور ہوئی ہیں یعنی یہ کہ شخص معلوم نے

میرے ساتھ دراندازی کی لیکن یہ خبر بالکل بے اصل ہے، واقعہ یہ ہے کہ بک صاحب

اور سید صاحب خیرہ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں ششماہ قیام کروں لیکن یہ محمود

دفعۃً اس کے مخالف ہو گئے اور اسی اپنی حالت میں بہت سی باتیں اس کے

خلاف کہیں لیکن اس قسم کی ان سے کسی کو اب شکایت نہیں رہی ہر روز یہاں

کے رُسا اور ٹرسٹیز اور ارکان کالج اسی قسم کی باتوں کے متعلّق ہوتے ہیں میں تو اس دن سے آج تک سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں، اس دفعہ یہ ظاہر یہاں کی آب و ہوا میں مجھ کو مضرت نہیں معلوم ہوتی باقی ترک تعلق اس کی یہ کیفیت ہو کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی عہدے کے لیے لی تھی میں نے دیکھا کُلّیئم کُلّیئم سال بھر برابر نہیں رہ سکتا وہاں کوئی ایسی دل چسپی نہیں کہ سال بھر تک کام چل سکے اس لیے کچھ یہاں کچھ وہاں کچھ ندوہ اس طرح بسر کرنے کا ارادہ ہی اگرچہ واقعہ یہ ہو کہ اب کہیں دل نہیں لگتا باطل خانہ بدوش معلوم ہوتا ہوں، نہیں معلوم کیا ہونا ہو؟ والسلام بھئی۔ (۹ نومبر ۱۹۰۷ء مولوی محمد اسحاق کے نام کالج سے ایک اور خط کا اقتباس بھی قابل ملاحظہ ہو جو مولوی محمد اسحاق کے نام کالج سے قطع تعلق کے بعد کا ہے اس میں آئندہ زندگی کا پروگرام بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”لکھنؤ یا علی گڑھ میں بستر ہوگا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ“ (۷ مارچ ۱۹۰۸ء)

اس عنوان میں پہلے ان کے اور رفقا کے درمیان جو اختلافات ہوئے ان کو غیر مربوط اور مخلوط واقعات

سرسید کی وفات

کے ساتھ یہ طور تمہید لکھ کر رقم طراز ہیں

”باپس ہمہ سرسید کے ساتھ وفات کا جو اثر مولانا پر ہوا اُس کا اندازہ اُس عربی خط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ساتھ کے دوسرے دن نواب علی حسن خاں کو بھوپال لکھا۔

نمی دائم حدیث نامہ چون است ہی دائم کہ عنوانش پر خون است
نضعضعت ارکان الملة، اعني انتقل السيد احمد خان بجاؤ

۱۔ کتابت کی غلطی سے سرفہ کی جگہ سرفہ درج ہو۔ سرسید کا انتقال ۷ مارچ ۱۹۰۸ء کو ہو چکا تھا۔

النجوار رحمت ربہ وذالک یوم الاحد ۲۷ مارچ و تفوت
شملنا انی لا اقدر علی ان اشتغل بشی الابلعد بسہلۃ
من الزمان، شبلی نعمانی ۲۹ مارچ ۱۸۹۵ء

(ترجمہ) قومی عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار
کے جوار رحمت میں گئے اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری
قوم کا شیرازہ بکھر گیا میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔
اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کی مدح انھوں نے
کئی دفعہ لکھی اس کے مرثیے میں ایک شعر بھی انھوں نے نہیں کہا مگر واقعات
کی رویداد آپ کے سامنے ہی اس کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ مدح لکھنے والے
کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانے میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور جھوٹی شاعری
اس کی افتاد طبیعت نہ تھی۔ (۳۳۱-۳۳۲)

اول تو بجز ایک قصیدے کے جو مولانا نے ۱۸۸۷ء میں اپنے والد کے ساتھ
حاضر ہو کر پیش کیا تھا اور کوئی مستقل نظم سرسید کی مدح میں نہیں لکھی البتہ مختلف اور
متعدد قومی نظموں میں بہت سے مذکورہ دو دو چار چار شعر آجاتے ہیں۔ دوسرے مرثیہ
کا نہ لکھنا تبدیلی قلب کی علامت نہیں ہو سکتی، مولانا نے اپنے منجملہ بھائی ہمدی
حسن کا بھی مرثیہ نہیں لکھا، جن کی محبت اور مرثیہ نہ لکھنے کی نسبت مستغف حیات لکھتے ہیں
کہ ”ہمدی مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے بہنوں کسی سے بات چیت نہیں کی
فرماتے تھے کہ والد مرحوم آتے تھے اور لوگوں سے ہستے بولتے تھے تو مجھے تعجب ہوتا
تھا۔ ایک مرتبہ مولوی عبدالسلام نے پوچھا کہ آپ نے ان کا مرثیہ نہیں لکھا تو بولے وہ اس
کب بجا تھے؟“ (۷۷۶)

مندرجہ بالا خط کے الفاظ اگر کوئی معنی رکھتے ہیں تو وہ خط ہزاروں مرثیوں سے

زیادہ جاں گداز اور دعو انگیز ہو اور کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اپنے بھائیوں باپ اور دیگر اعزہ کی موت کا یہ اثر ہوا ہو کہ بھی ہوتا من الزمان وہ کوئی شغل اختیار کرنے کے ناقابل ہو گئے ہوں۔

مصطفیٰ حیاتِ شہلی نے سرسید اور مولانا کے تعلقات بیان کرنے میں جو واقعہ آفرینیاں کی ہیں یہی ایک خط، بجائے خود اُن کا پورا جواب ہو لیکن اگر مصطفیٰ کا بیان مان لیا جائے تو کہا جاسکتا ہو کہ جتنے مواقع پر سرسید کی مدح کی اس میں اپنا تقرب ذاتی شہرت اور حلیب منفعت مطمح نظر تھی اور اب ان کی موت کے بعد کوئی امید وابستہ نہیں تھی اور حیدرآباد میں کارلج کی مساوی تنخواہ کا منصب بھی ہو چکا تھا، نیز آئندہ توقعات تھیں اس لیے مرثیہ بھی نہیں لکھا، مولانا نے سلسلہ میں سرسید کے ساتھ حیدرآباد گئے تھے ایک نظم میں وقار الامرا کی مدح کی تھی پھر سلسلہ ۶ میں جب وہ کانپور آئے تو شاندار قصیدہ لکھا سلسلہ ۷ میں منصب مقرر ہوا اور اعیانِ حیدرآباد کے پاس سناٹے کے جواب میں جو نظم پڑھی اس میں بھی سر وقار الامرا کی مدح تھی لیکن مارج سلسلہ ۶ میں جب اچانک طور پر ان کا سانحہ انتقال پیش آیا تو ایک قطرۂ اشک کا بھی نشان نہیں ملتا حالانکہ وقار الامرا نے منصب مقرر کرایا اور نظامتِ علوم و فنون پر مامور کیا، اگرچہ مولانا کے اولین محسن و مربی سرسید تھے مگر دوسرے محسن سر وقار الامرا کے احسان بھی کم نہ تھے ان دونوں کی موت کے بعد ان کو اس طرح بھلا دینا ایک احسان شناس طبیعت کا خاصہ نہیں ہو سکتا،

زندگی کا دوسرا دور

مولانا شہلی اور ندوہ | مولانا کی زندگی اور حیاتِ شہلی کا بڑا تماشہ نگاہ
”ندوۃ العلما“ جو جس کے لیے انھوں نے کارلج کی

ملازمت کے دوران میں ہی سہ زیریں سپس ندوہ و تدریس علوم عرب است کا فہرہ لکھا یا تھا اور خواجہ حافظ نے نصیحت کی تھی کہ سہ وقت آن سہ کہ پورو و کئی زنداں را لیکن سنہ ۱۸۹۶ء میں کالج سے رخصت ہو کر مولانا تو وطن آئے یہاں سے درستی صحت کے لیے کٹنیر گئے، وہاں سے واپس ہو کر دوسری شادی کی (پانچ سال ہوئے کہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا) چند روز نئی زندگی کا لطف و حظ اٹھا کر حیدر آباد گئے اور سررشتہ علوم و فنون کی نظامت قبول کر لی البتہ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں پھر ندوہ یاد آ یا اور باقاعدہ اعلان کرایا کہ مصمم ارادہ کر لیا ہو کہ سب چھوڑ چھا کر ندوہ کے آستانے پر آ بیٹھوں اور اپنی عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دوں (۲۸۶ حیات) لیکن اب بھی تصیم ارادہ میں کسر رہ گئی تا آن کہ حیدر آباد کے وزارتی انقلاب سے دل برداشتہ ہو کر کھنڈو آئے اور معتدی دارالعلوم کا جائزہ لیا، اگرچہ مولانا کو ندوہ کے انتظامی و مالی معاملات سے تعلق نہ تھا لیکن ان کی توجہ اس طرف بھی مبذول ہوئی اور اپنے اثر سے جو محض علی گڑھ کی وجہ سے حاصل تھا بہت کام یابی بھی ہوئی۔ اس زمانے میں تقیم ہنگال کے خلاف ایچی ٹیشن جاری تھا اور دہشت انگیزی بھی وسیع ہوتی جاتی تھی اگست سنہ ۱۹۰۹ء میں حکم ران صوبہ سرجان پر سکاٹ ہیوٹ نے بہ مقام آگرہ دربار کر کے ایک تقریر کی جس میں دہشت انگیزی کے متعلق تنہات تھیں اسی جہینے کے رسالہ الندوہ میں ہونوۃ العلماء کا آرگن تھا مولانا نے ایک اہم مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ”مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے“ مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی زندگی میں یہ مسئلہ دراصل روج حیات ہو اس موقع پر اس کے چند فقرات نقل کیے جانے ناموزوں نہ ہوں گے۔

”تا نا ریوں نے جب تمام ایران اور عراق پر قبضہ کر لیا تو اس وقت

نفعہ کی جتنی کتابیں تصنیف ہوئیں سب نے فتویٰ دیا کہ دارالاسلام باقی

رہے گا، غور کرو فقہانے تانارپوں کے زمانے میں یہ فتویٰ دیا تھا جو بہت سہل
 تھے اور جن کو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہ تھی آج جب کہ عیسائی
 حکومت جو اہل کتاب ہیں مسلمانوں کے فرائض مذہبی میں کوئی تعرض نہیں
 کیا جاتا مسلمان خود عیسائی مذہب کا زور و شور سے سراپا زار رو ڈھرتے ہیں تو
 ایسی حالت میں کیا شبہ ہو سکتا ہو کہ حکومت کی وہی پوزیشن ہوگی جو اکبر و
 جہاں گیر کے زمانے میں تھی اور فقہاء کا یہ حکم واجب العمل ہوگا کہ وجہ علینا
 اقتباسہم (در غنار) اور ہم پر ان کی اطاعت واجب ہوگی واقعات
 مذکورہ بالا سے تم کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ دہرے سے لے کر آج
 تک مسلمانوں کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا کہ وہ جس حکومت کے زیر اثر رہتے اس کے
 وفادار اور اطاعت گزار رہتے یہ صرف ان کا طرزِ عمل نہ تھا بلکہ ان کے مذہب
 کی تعلیم تھی جو قرآن مجید حدیث، فقہ سب میں کنایتہ اور صراحتاً مذکور ہے
 ما قسّم سکندر و دارانہ خواندہ ایم ازما بہ جز حکایت جہر و وفا پیرس۔
 ندوہ اور حکومت کے روابط میں یہ کڑی سب سے مضبوط اور اہم کڑی تھی نتیجے
 میں نومبر ۱۹۷۹ء تک بلا مشروط پانچ سو پڑی ماہدار کی امداد منظور کیے جانے کی اطلاع
 گورنمنٹ نے دی اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسے کے نصاب اور اصول میں
 کبھی کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور اس امداد کا یہی ادب عربی اور انگریزی اور ریاضی
 وغیرہ مدرسے کی غیر مذہبی تعلیم میں خرچ ہوگا۔ (۱۹۷۸ء)
 اس کے علاوہ حکومت نے بہت رعایت کے ساتھ تعمیر دارالعلوم کے لیے
 ایک خوش منظر قطعہ زمین بھی عطا کیا اور ۲۸ نومبر کو حکم راجن صوبہ نے سنگ بنیاد
 بھی نصب کیا۔
 اس رسم کے متعلق مصنف حیاتِ نبلی لکھتے ہیں کہ

”اس زمانے کے حالات کے مطابق یہ مناسب معلوم ہوا اس مدرسے کا ظاہری سنگ بنیاد یوپی کے گورنر سر جان پرسکاٹ ہیوٹ رکھیں تاکہ اودھ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی دور ہو“ (۸۴ م حیات)

اس سلسلے میں آئندہ اوراق میں تحریر کرتے ہیں کہ
”مولانا مرحوم نے اس جلسے کا حال خود اپنے قلم مستر رقم سے لکھا ہوا ہے ہم یہاں انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں“:

”بگڑا دیں حرف و ذکر مہر میں خواب خوشی دیدم و دیگر مہر میں
تندی بود و حسرت اہم ہنوز دیدہ من باز و بہ خوابم ہنوز
ہماری آنکھوں نے حیرت فراموشا گیا ہوں کی دل فریبیاں بار بار بگھی
ہیں جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظروں سے گزرا ہو گا فرسنوں اور انجمنوں کا
جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں و غط و پند کے پڑا اثر جیسے بھی ہم کو مست اثر
کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا وہ ان سب کے بالاتر ان
سب کے عجیب تر ان سب کے حیرت انگیز تھا، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ بڑی ٹوپیاں
اور عمامے دوش بہ دوش نظر آتے تھے یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی
فرماں روا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے یہ پہلا ہی
موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک
تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب
کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا)
خوش یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، ہندی
حنفی، وہابی، برہمن، زائد، صوفی، و احط، فرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع
تھے سہ آباد ایک گھر ہی تہاں خراب میں“ (۸۴ م حیات)

مگر مصنف کے الفاظ اس زمانے کے حالات کے مطابق، سنگِ بنیاد، اگرچہ پخت کے اعتبار سے تو معنی رکھتے ہیں مگر واقعہ اور محل و موقع کے لحاظ سے جس قدر عمل ہیں ان پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اور دھوکے تعلقہ داروں کی بدگمانی بھی یہاں ایک پہل اضافہ ہو، حالاتِ جلسہ جو قلمِ مسرتِ رقم سے لکھے گئے ہیں ان کی اس تہید کا (جو منقول ہو) زور و بیان دیکھنے کے ساتھ انقلابِ خیالات اور بالخصوص اس جوش کو دیکھیں جو ایسے مفکرِ سیاسی اور مذہب کے شیدائی کے قلم سے ٹپکا پڑتا ہو جو سرسید کی سیاست اور وفاداری سے بے زار تھا، پھر ایک عیسائی فرماں روا کے سامنے مقدس علما کا ادب سے خم ہونا بھی دیکھیے، جن علما میں خود مولانا بھی تھے جن کی نسبت مصنف کا ادا ہو کہ ان کی گردن بڑے سے بڑے جباروں کے سامنے نہیں ٹھکی یہاں تک گردن کے سامنے نہ صرف اپنی گردن جھکا دی بلکہ بڑے بڑے علما اور جانشینانِ پیغمبر کی گردنیں جھکوا دیں۔ مگر اس تمام بیان میں جو پانچ صفحات میں ہو سپاس نامے اور جواب کا چند سطروں میں مختص یا اقتباس بھی نہیں جو روح و جانِ سخن، اپنی نوعیت میں منفرد اور مولانا کے سیاسی و علمی و جذبہِ مذہبی کی یادگار ہو، سپاس نامہ عربی میں تھا، اس میں ندوہ کی تاریخ، مقاصدِ تعلیم، معطیان اور رسولِ حکام کی شکر گزاری کے بعد عرض کیا تھا کہ

”حضور نے ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد نصب کرنے سے اس مساعمت اور پے تعصبی کی ایک اور مثال قائم کی ہو جو انگریزی قوم کا خاصا اور انگریزی گورنمنٹ کا عموماً حکومت ہو۔“

اس کے بعد مسلم قومیت کی تریف، زمانہ حال کے علما کی تنگ خیالی، پست خسیالی، جزیئی مذہبی تنازعات، ندوہ کی دیگر مدارس کی نسبت خزانِ امتیاز دکھا کر لکھا تھا کہ

”ہمارے طلبا تعصبِ رنگِ خیالی اور بے ہودہ جوش و خود سر دی سے بری

مفت کر کے جائیں بروقت معائنہ کرنے دیا جائے ان خیالات کے لحاظ سے اور اس
 امید سے کہ آپ کے دارالعلوم میں ایسے عربی و فارسی کے عالم دست یاب ہوں گے
 جو اسکوٹوں میں پڑھانے کے کام کے لیے مفید ہو سکتے ہیں گورنمنٹ نے یہ تجویز
 کر لیا کہ آپ کو وہ زمین دے جس پر اس وقت ہم سب موجود ہیں..... یہ معلوم
 ہونے سے بھی مجھ کو بڑی خوشی ہوئی کہ لکھنؤ کے سول حکام آپ کے ندوہ سے توجہ
 اور ہم دردی کے ساتھ سلوک کرتے رہے ہیں۔

مصنف نے اس رویداد کے بیان میں اکبر اور مولانا شبلی کی نظم کو جگہ دی مگر
 مولانا حالی کی نظم کا ذکر تک نہیں کیا اور علی گڑھ پر (بجائے شکریہ) یہ تعریف کڑی
 کہ اس جلسے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ علی گڑھ پارٹی کے ارکان آفتاب احمد خاں
 ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور کالج اور کانفرنس کے دوسرے ارکان جو ابھی تک ندوہ کے
 کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ شریک اجلاس ہوئے۔

(۲۸۶ حیات) یعنی علی گڑھ والے ندوہ سے الگ الگ رہے تھے۔ مگر وہ سب
 مع مولانا شیروانی کے علی گڑھ اور کانفرنس کے ہی ارکان تھے جنہوں نے ہر موقع پر
 اور خاص کر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ندوہ کی چڑو تائید کی تھی خود مولانا بھی عرصے
 تک اسی زمرے میں تھے اور کالج و کانفرنس کا سکریٹری (نواب وقار الملک) ندوہ کے
 زمرہ ارکان میں تھا، مصنف نے اس اہم واقعے کو بھی نظر انداز کر دیا کہ کالج کے طلباء
 کی ایک جماعت بھی اس جلسے کی شرکت کے لیے آئی تھی جس کو طلباء نے ندوہ نے
 مخصوص طور پر مدعو کر کے عہد مواخات باندھا۔

مولانا کی ندوہ سے مسلسل ۱۸ سال تک وابستگی کے بعد (جس میں آٹھ سال
 ان کی سرگرمی نہ مساعی شکوک کا زمانہ بھی شامل ہو) الگ ہونا یعنی سلسلہ عین عہدی
 سے استعفا اور اس کے اباب نیز بعد کے واقعات اُن کی زندگی کے سانحات عظیم

ہیں اب دیکھنا یہ ہو کہ مصنف حیاتِ شبلی نے اس بیان میں کہاں دیانت و راستی سے کام لیا ہو لکھتے ہیں کہ

”جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلی جاتی تھی اور اس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک سبق بنتا جاتا تھا یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، گو یہ واقعہ تھا مگر واقعے کو واقعہ سمجھ کر برداشت کرنا ہر انسان کا کام نہیں، اس لیے رشک و حسد نے بے اعتمادی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا ان کے تمام دوسرے مخالف رفقا اخلاص اور حسن نیت سے خالی تھے ایک بڑی جرأت ہو یہ تو بالکل ظاہر ہو کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علی گڑھ میں بسر ہوا تھا اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی شہرت عام رکھتی تھی لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کو اس وابستگی کے باوجود اس تحریک کے بعض حصوں سے سراسر اختلاف تھا اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے مگر عام علما اور ان کے معتقد ارکان یہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوے میں اسی لیے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کر دیں (۶۲۷ و ۶۳۸ حیات)..... جب مولانا نے ندوہ میں قیام کا ارادہ کیا تھا اس وقت نواب محسن الملک نے کہا تھا کہ ندوہ کی اس کس میرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعاً تمام مولوی

۱۔ مضمون بروقات مولانا شبلی نوشہہ نواب صدیاً جنگ مولانا حبیب الرحمن

نماں مشیروانی -

آپ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آمادہٴ مخالفت ہوں گے یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جلسہ سنگب بنیاد ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی مولوی خلیل الرحمان صاحب سہارن پوری مرحوم جو پہلے رسماً نائب ناظم تھے اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے یہ طورِ حریت کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے اور اس کی ابتدا ایک خط سے ہوئی جس میں مولانا نے ان کو یہ لکھا تھا کہ اس وقت ندوہ کا کوئی ناظم نہیں (حالاں کہ مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم اپنے آپ کو ندوہ کا قائم مقام سمجھتے تھے) بہر حال اس کے بعد مولوی خلیل الرحمان صاحب نے اپنی مخالفت کا اظہار (جس کو کون کہہ سکتا، کہ نیک نیتی پر مبنی نہ ہوگا) مختلف پردوں میں کیا (۱۳۹۶ھ تا اب) ابھی تک تو مولانا شبلی کا اختلاف علی گڑھ کی تحریک سے بیان کیا جاتا رہا اب بعض حصے اختلافی بن گئے مگر مصنف نے ان کی تشریح نہیں کی محض مغالطے کے لیے صبیحہٴ جمیع استعمال کر دیا، یہ امر کہ عام علما اور ان کے معتقد ارکان مولانا کی شرکت کو ندوہ کی بنیادی پر محمول کرتے تھے واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، مولانا پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء میں شریکِ جلسہ ہوئے اور ایک دستور العمل پیش کیا جس پر تین جید علمائے غور کیا عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدارس کی تنظیم کی تجاویز پیش کیں ترتیب نصاب کی مجلس میں من جملہ بارہ ارکان کے ایک مولانا بھی تھے، ۱۸۹۵ء میں ناظم کی طرف سے وفدِ اوسنائی فرائض علما پر تقریر کی اور مجوزہ دارالعلوم کا خاکہ جو انھوں نے مرتب کیا تھا منظور ہوا۔

۱۸۹۶ء کے اجلاس میں مجلس دارالعلوم کے قواعد مرتب کر کے پیش کیے اور بیٹنے کے وفد علما میں شریک ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم کی ضرورت پر پُر زور تقریر کی۔ مارچ ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ کو جو وفد دارالعلوم کے لیے مناسب جگہ تجویز

کرنے لگا اس میں شریک تھے، یہ سب علی گڑھ کے زمانے میں ہوا۔ ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء بعض مشاغل، خانگی معاملات، عقد، حیدرآباد کی ملازمت کی وجہ سے کسی اجلاس میں شریک نہ ہو سکے، یہی زمانہ ندوہ سے حکومت کی بدگمانی کا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں علما کی مجلس خاصہ میں نصاب کے مسئلے پر طول طویل بحثیں ہوئیں اور مولانا کی حیثیت ہوئی مسئلہ میں اگرچہ شریک اجلاس نہ تھے لیکن بالاتفاق معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے اور طوہا کہ مولانا سے درخواست کی جائے کہ وہ کھنڈا کر قیام کریں۔

۱۹۰۴ء میں ایک جلسے کی صدارت کی اور نصاب کا اہم مسئلہ طوہا فروری ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کی معتمدی کا جائزہ لیا، حیاتِ شبلی ہی میں یہ گیا۔ ۱۹۰۵ء سال کی روداد ہو جس میں کوئی موقع اور کوئی وہم بھی اس بات کا نہیں کہ علما سمجھتے ہوں کہ مولانا ندوہ کی بربادی کے لیے شریک ہوئے بلکہ روز بروز ان کی اہمیت و ضرورت بڑھتی جا رہی ہو، پھر اس مدت میں چھ سال تو ایسے ہیں کہ وہ علی گڑھ سے جدا ہو چکے ہیں البتہ ۱۹۰۶ء کی روداد سے جو مولانا نے ہی لکھی ہو یہ پتہ تو چلتا ہو کہ کانفرنس میں ندوہ کے متعلق جو تائیدی رزلوشن پاس ہوا اس پر بعض لوگوں نے بدگمانی کی اور سمجھا کہ اس کی ہم دردی کی تم میں کچھ نہ کچھ ہو مگر مولانا نے اپنی نسبت کسی شک کا اشارہ نہیں کیا، پھر تو ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۷ء مولانا ہی مارندہ نظر آتے ہیں مصنفِ حیات نے اپنی تائید میں حاشیے پر مولانا شیروانی نواب سدھیا جنگ کے ایک مضمون کا جو مولانا شبلی کی وفات پر تھا حوالہ دیا ہو اور احباب علما کے ذکر میں صفحہ ۸۰۰ پر اس کا ایک اقتباس (ابتدا کا اہم حقہ حذف کر کے اور آخر میں کچھ اپنی طرف سے بڑھا کر پیش کیا ہو، ہم اس اقتباس کو اس اہم حقے کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور اضافے کو علاحدہ دکھاتے ہیں۔

۵۱ یہ مضمون بہ اقتضا جنوری ۱۹۰۷ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوا ہو۔

حصہ مخدوف

”ندوة العلماء کے ساتھ علامہ شبلی کو ابتدائے قیام مجلس مذکور سے تعلق تھا اور وہ ان چند مخصوص ارکان میں تھے جنہوں نے ندوہ کے مقاصد کو پورے طور پر سمجھ کر اس کی کامیابی کو نصب العین قرار دیا تھا مولانا سید محمد علی ناظم اول کی دُور بین اور مردم شناس نظر نے ابتدا سے یہ امر محسوس کر لیا تھا کہ ندوہ کے بعض مقاصد ایسے ہیں جن میں علامہ شبلی کی رہبری کی ہمیشہ ضرورت ہوگی دارالعلوم کی اسکیم انہی کے داغ کا نتیجہ تھی، جو رسالہ ندوة العلماء نے اس کے متعلق شائع کیا وہ انہیں کے قلم کا لکھا ہوا تھا جب تک مولانا سید محمد علی کی نظامت رہی مختلف خیال کے ارکان اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے رہے اور باہم تصادم نہ ہوا مولانا کی علاحدگی کے بعد پھر کوئی ایسا ناظم نہ ملا جو مختلف الخیال کے ارکان سے کام لے سکتا۔“

حصہ منقول

”علامہ شبلی چوں کہ ساہا سال کالج میں رہے تھے ایک حد تک ان کے خیالات آزاد تھے علما کے مروجہ طریقوں کو وہ لازم دین خیال نہیں کرتے تھے اعتراض کرنے میں بے باک تھے ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے لہذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علما کو ان کی جانب سے شبہات تھے بعض کا عرصے تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے تاکہ یہاں بھی اتحاد کا رنگ جمائیں خلاصہ یہ کہ آخر وقت تک علامہ شبلی قدیم طبقے کے علما میں شیر و شکر نہ ہو سکے۔“ (۸۰۰ حیات شبلی)

حصہ زائد

”تاہم اس قدر کہنا ہے جانے ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی قدیم و جدید

سوسائٹی کی صلح و عاشقی کا لیکن انہوں نے مذکورہ بالا اختلاف نے ان کو ششپہا
کو بار آور نہ ہونے دیا۔

(بقیہ مضمون کی اصل عبارت یہ ہو کہ) ”اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی
خداات نے ندوۃ العلماء کے قالب میں ایک تازہ روح پھونکی بہت سے مرحلے
طو کیے لیکن جو کام باپ حاصل ہونی چاہیے مٹی وہ باہمی تصادم خیالات نے
ہونے دی ہماری بہت سی محرومیوں میں ایک یہ بھی ہو۔“

دیکھیے کہ مصنف نے محولہ بالا مضمون میں کس قدر کھلی قطع و برید اور اضافہ کو
جائز کر دیا اور مفہوم کتنا بدل دیا، رسماً نائب ناظم بھی ایک نئی اصطلاح ہو یہ عہدہ
اسی لیے وضع ہوا کہ اگر ناظم (جناب) کسی وجہ سے نہ ہو تو نائب اس کی جگہ کام
کرے تمام دستوری کمیٹیوں میں نائب کا عہدہ عموماً رکھا جاتا ہے، مولوی خلیل الرحمن
اپنے کو بجا طور پر قائم مقام سمجھتے تھے خود مولانا نے ان کو تبلیغ کیا اس نے ایک موقع پر
لکھا ہے کہ ”میں وزیر بن کر تو کام کر سکتا ہوں بادشاہ بن کر نہیں۔ (خط موسومہ بشیروانی
مسلطہ ۱۹۱۲ء مکاتیب)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ساداتِ بارہ کی سی وزارت چاہتے تھے۔
ابتداءً مولانا اور ارکانِ ندوہ کے مابین جو کچھ اختلاف تھا وہ صرف نصابِ تعلیم
کے متعلق تھا اور جن ارکانِ مخالفت میں مولانا بشیروانی بھی تھے، اس اختلاف کے متعلق
مصنف حیاتِ شبلی نے اس مراسلت کے جو ان دونوں مولاناؤں کے مابین ہوئی ہو
اقتباس و حوالے بھی دیے ہیں، لیکن ایک خط کو جو تمام معاملے پر روشنی ڈالتا ہے
نظر انداز کر دیا ہے اور وہ یہ ہو کہ

”کسی اور کی جو نیت ہو وہ ہو لیکن میں ندوہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو
صرف اس لیے کہ ایک مذہبی خدمت انجام دوں دنیوی جاہ و عزائم درجی

شہرت کے لیے علی گڑھ کا میدان بہت اچھا ہو ابھی ابھی نواب حسن الملک کا خط آیا کہ فٹنس گورنر حال نے میرے متعلق فیصلہ کر دیا اور اسے دی کر پا ہو تو علی گڑھ ان کو بلا لو اس سؤرت میں مانی فائدہ بھی ہو اور شہرت بھی باوجود اس کے اگر ندوے میں آنا چاہتا ہوں تو اس میں کیا خود غرضی ہو سکتی ہو باوجود اس کے میرے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہو کہ ایک بار میں نے ندوہ میں قیام کر کے فہرست اساتذہ طلب کی کہ لوگوں کے نام مرا ملت متعلق ندوہ کر سکوں باوجود اصرار کے ناظم صاحب اور مددگار صاحب نے تعطل کیا اور بڑی مشکل سے بارہ نام عنایت کئے، نصابِ سلیم پر میں برسوں غور کر چکا ہوں مصر کی اصلاحات کو دیکھتا رہتا ہوں وہاں سے جدید کتابیں جو اب تک کسی کے پاس نہیں پہنچیں ان کو منگوایا ہو باوجود اس کے اس کمیٹی سے خارج رکھا گیا ہوں رسالے میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دُعا گوئی اور طبل نوادی کا کام لینا مقصود ہو مجھ کو یہ پسند نہیں کہ ایک مذہبی مجلس میں شریک ہو کر جوڑ توڑ کروں اپنا اثر بڑھاؤں مخالف کو شکست دوں اس جنت سے نو ذرخ بھلی اس مردی سے ناروی بہتر، محنتی، ہم مسلمانوں کی فطرت خدا نے باطل تباہ کر دی ہو آپ کیا کریں گے اور کوئی کیا کرے گا جس کا بچی چاہے سکریٹری مددگار ناظم وغیرہ بن لے اور اس عزت پر اتر لے باقی کام ہونا تو یہ قیمت ہی میں نہیں پھر کیا فائدہ (علامہ شبیر الدینی)

۶ ستمبر ۱۹۱۷ء

ابھی سین میں متعدد خطوط اسی مضمون اور اسی قسم کے اور بھی ہیں تاہم مولانا کی جیت ہوتی ہو اور ندوے میں اگر وہ نیا نصاب بھی جاری کر دیتے ہیں، اور جیسا کہ مصنف کا بیان ہو ابتدائے مخالفت جلسہ سنگب بنیاد مشفقہ سے ہوئی ہو اس

مرنے میں بھی علی گڑھ محرک اور ندوہ کی بربادی کا کوئی واہمہ نہیں بلکہ بقول مولانا شبلی
 ”اسل یہ ہو کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمن صاحب بلکہ مولوی عبدالحی
 صاحبہ کو بھی کسی قدر یقین ہو کہ میں ان لوگوں کے استیارات میں دست اندازی کرتا
 ہوں اور ان کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں اور اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے“ (شیرانی
 ۳۰، ستمبر ۱۹۷۱ء، ۶۴۱ حیات)

ان تمام واقعات کو بار بار پڑھیے اور دیکھیے کہ کہیں بھی خفیف نشان پایا جاتا ہو
 کہ اس مخالفت کا باعث علی گڑھ یا اکثر علما اور ان کے متقیدین کا کوئی خیال تھا بلکہ
 صاف ظاہر ہے اور مصنف بھی پردہ نہیں ڈال سکے کہ اصل وجہ اقتدار و اختیار کی ہوا
 دوس اور کش مکش اور شک و حسد ہو مگر علی گڑھ پر ہی تان توڑی گئی ہو۔
 یہ بات ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہو سکتی ہو کہ ان وجوہ اختلاف ہوتے ہوئے بھی
 مصنف قدم قدم پر مخالفت و نفقہ کے اخلاص اور حسن نیت کا بھی اعتراف کرتے جاتے ہیں۔
 نواب صدر یار جنگ مولانا شیرانی نے اپنے مضمون میں الحاد کا رنگ جمانے
 کی بدگمانی کا ذکر کیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہو کہ ”بعض کا سوسے تک یہ خیال رہا“
 ممکن ہو کہ ابتدا میں عسے تک رہا ہو مگر واقعات مابعد بتاتے ہیں کہ ان بعض کا بھی یہ
 خیال جا رہا تھا، البتہ پہلی مرتبہ سلسلہ میں طلبائے ندوہ کی مذہبی حالت کی تحقیقات
 کے لیے ایک کمیشن کی تجویز ہوئی اور مخالفت نے طوں پکڑا تو مولوی خلیل الرحمن کے
 رفتار نے الحاد کا حرم استعمال کرنا چاہا، مولانا نے ۱۴ ستمبر ۱۹۷۱ء کے خط موسومہ
 مولانا شیرانی میں لکھا ہو کہ

”کمیشن کی شہرت نے بہت بڑا اثر پیدا کیا اول تو تمام شہر میں مشہور ہو کہ فلاں
 شخص علیحدہ کر دیا گیا دوسرے اس کی پختگی کے لیے شاہ سلیمان صاحب وغیرہ
 ہر جگہ یہ چچا پھیلارہے ہیں کہ فلاں شخص کی نسبت تمام ہندستان میں بے نیدگی“

ان کا مشہور عام ہو گیا ہو اس لیے اب ان کے امتساب سے ندوے کو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا (نمبر ۲) مکاتیب شبلی

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا شبلی اکھلام و علم اکھلام لکھ چکے تھے اس کمیشن میں خود مولانا کی شہادت ایک سوال تھا جس کو وہ اپنی توہین سمجھتے تھے اس کے متعلق مولانا شیردائی کو انہوں نے دو خط مفصل لکھے مصنف حیات شبلی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے صرف ان کے حوالے پر اکتفا کی تاکہ واقعے کی صورت حال پر نقاب پڑا ہے اور جن کے اخلاص اور حسن نیت پر عقیدہ ظاہر کیا گیا ہو اس میں تزلزل نہ ہو، ان خطوط میں ۱۶ ستمبر ۱۹۰۷ء کا خط نمبر ۸۶ مندرجہ مکاتیب شبلی یادگار ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

”بے شک میں اس وقت اس کارروائی پر راضی ہو سکتا ہوں جب اس کے ساتھ اور معتمدین پر کمیشن بیٹھے ہیں اس کو قطعاً ثابت کر سکتا ہوں کہ فلاں صاحب کی نافرمانی نہیں پڑھتے فلاں صاحب نے اپنی غلطی اس وقت تک بڑا دوں رہیہ لوگوں پر ضائع کر دیا ہے یعنی لوگوں نے کمرے کی تعمیر کے لئے رہیہ دیا تھا وہ تعلیم پر صرف کر دیا گیا و علیٰ ہذا فلاں صاحب نے وقف کر کے اپنی جائیداد دارالعلوم کو نہ دی اور اب تک رکن ندوہ میں مکان دارالعلوم کا رہیہ ندوہ ادا کر چکا باوجود اس کے و شاید واپس نہیں کرتے اور اسی وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ دفعہ جلسہ انتظامیہ میں منظور ہو چکا کہ مکان موجودہ فروخت کر ڈالا جائے وہ فروخت نہیں کرتے..... اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طلباء میں تقدس کا اثر نہیں..... اس کی وجہ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتدا سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور یا اثر نہیں ملا۔ ایک زمانے میں مولوی فاروق صاحب مرحوم تھے وہ خود بے پڑا تھے

مولوی علیہ السلام..... صاحب خود پابند تھے لیکن اثر کچھ نہ تھا خود ان کا لڑکا مولوی علیہ السلام..... ڈاڑھی ترشواتا تھا اور وہ کچھ نہ کہتے تھے اس کی نماز فجر نہ پڑھنے کی میں نے شکایت کی تو فرمایا رات کو مطالعہ زیادہ دیکھتا ہو اس لیے صبح کو سو جاتا ہو..... میں جب حیدر آباد سے آیا تو دیکھا کہ دارالانوار (ریڈنگ روم) میں طلباء نے نواب محسن الملک وغیرہ کی تصویریں لٹکا رکھی ہیں، نماز نہ پڑھنے پر گوشت کا پیالہ بند کیا جاتا تھا لیکن ہر روز دس پانچ بند رہے۔“

غرض اس تمام جھگڑ کے بعد کرنل عبدالمجید خاں (ٹپالہ) نے مصالحت کرادی یہ علمائے کرام باہم بغل گیر ہوئے (۶۴۳) لیکن کچھ ہی عرصے تک سکون رہا تھا کہ رسالہ الندوہ کے ایک مضمون سے پھر شدید تصادم ہوا، بقول مصنف

”اس وقت جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑا استیصال

تھا مولوی عبدالکرم صاحب نے اس موقع کی مناسبت سے اپنے پہلے ہی مرتبہ پرچے

میں جو سال ۱۹۱۷ء کے آخر میں جون ۱۹۱۷ء کے مہینے میں چھپا جہاد کے فضائل و

مناقب پر ایک طویل مضمون شائع کیا اس زمانے میں لفظ جہاد کے نام کی

ہیبت جو انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اس کا تصور بھی آج شکل ہو

اور ندوہ ابھی ابھی ان سیاسی الزاموں سے حکومت کی نگاہ میں بری ثابت

ہوا تھا اس مضمون کی اشاعت نے ندوہ کے کارکنوں کو گھبرا دیا مولانا نے

۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو معتمدین اور مقامی ارکان کو بلا کر صوَرِ حال پیش

کی سب کی متفقہ رائے سے وہ چند روز کے لیے معطل کر دیے گئے اور اس

کارروائی کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دی گئی یہ کارروائی اگرچہ معتمدین اور مقامی کان

کے اتفاق رائے سے کی گئی تھی لیکن مخالفین نے اخبارات میں جھبے و غل

کیا تو ان میں سے متعدد ارکان نے اپنی برات ظاہر کی اور آخر چند دیگر ارکان نے جن میں مقامی وکلاء تھے ۹ راجہ سلاطین کو ایک جلسہ نظامیہ کر کے اس قانونی نقص کی بنا پر اس کو منسوخ کرایا کہ اس معطلی کا قانونی اختیار نہ مستدین کو تھا نہ صرف مقامی ارکان کو۔ (۶۴۴)

مولوی عبدالکرم کے متعلق بھی مصنف کا ریمارکس ہو کہ ”موصوف اچھے خاصے طباع اور ذہین تھے مگر افسوس ہو کہ اس ذہانت کا رخ دوسری طرف تھا وہ بہت جلد دوسروں کے ساتھ اثر میں آگئے جنہوں نے ان کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا نہ مقابل بنا کر کھڑا کیا۔“ (۶۴۴) مصنف نے اس واقعہ کو مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۸۵ کے حاشیہ پر بھی لکھا ہو کہ ”مولوی عبدالکرم دارالعلوم کے ایک لائق مدرس تھے مولانا کے بعد اندوسے کی اڈیٹری مقامی ارکان نے سپرد کی جتنی جس کے وہ حقیقت میں اہل نہ تھے اسی آئینہ اسخوں نے جنگ طرابلس کے زمانے میں جب مسلمانوں کے جذبات بے انتہا فروختہ تھے اندوہ ج ۹ نمبر ۶ میں جہاد پر ایک غیر مال اندیشہ مضمون لکھا ہو گو اس وقت کے سام جذبات اسلامی کے مطابق تھا لیکن احکام اسلامی کے مطابق نہ تھا۔“

مکاتیب اور حیات کے بیانوں میں جو تضاد ہو اس پر کسی ریمارک کی ضرورت نہیں، لیکن حیات میں یہ نیا واقعہ پیدا کیا گیا کہ جہاد کے نام کی ہیبت جو انگلیزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی، حالاں کہ اس جہاد وہ ہیبت کا پتہ نہ تھا اور ملتان ڈھرتے اور آزدادی سے مجاہدین ترک و عرب کی ہم دزدی میں جلے کر رہے تھے اور بعض مواقع پر تیز زبان بھی استعمال کی گئی، پھر اس ہیبت جہاد میں اخبارات کا شور و غل کیا معنی، اور اس پر مستزاد یہ کہ دیگر ارکان اور مقامی وکلاء بے خوف ہو کر معطلی کے حکم کو منسوخ بھی کر دیتے ہیں پہلے یہ مضمون غیر مال اندیشہ اور احکام

اسلامی کے غیر مطابق تھا مگر اب متوقع کے مناسب اور مبنی بر فضائل و مناقب ہو گیا
 بہر حال جو کارروائی مولانا نے کی تھی اور ناجائز قرار دی گئی وہی بالآخر دوسری
 جماعت نے بھی کی،

مولانا کے خلاف جو شور و شعلہ مچا دیا گئی اس کے متعلق بھی خود مصنف کو مولانا
 نے جو ہدایت کی وہ اگرچہ حیاتِ نبلی میں نہیں ہو لیکن مکاتیب میں ہو کہ ”انتہار کا جواب
 لکھنا ضرور ہو ان منافقین نے ایک طرف تو حکام میں یوں سرخ روئی پیدا کی کہ مولوی
 عبدالکرم کی معطلی پر ہم نے لوگوں کو آمادہ کیا اور مجاہدی حاصل کی دوسری طرف مجھ کو
 قوم میں سخت بدنام کیا اور اپنی برأت کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں اور یہ سب کو یقین
 دلایا کہ ہم نے جو کچھ کیا نبلی کی دھمکی سے کیا (خط ۱۴ موسومہ سلیمان) کیا یہ وہی شرار
 نہیں جن کے حسن نیت و اخلاص کا اعتراف ہو۔

مولانا کے استعفیٰ کے بعد اسٹرائیک اور تحریکِ اصلاحِ ندوہ بھی مولانا کی
 زندگی میں ایک بڑا سانحہ نظر آتی ہو لیکن مصنف حیاتِ نبی نے اس میں بھی خفائے
 واقعات کی حیرت انگیز مثال پیش کی ہو،

مولانا نے جولائی ۱۹۱۷ء میں بمبئی سے استعفا بھیجا بعض دوسرے ارکانِ
 اور متدین بھی مستعفی ہو گئے، ۱۸ تا ۲۰ جولائی کے جلسہ انتظامیہ میں یہ استعفیٰ منظور
 ہوئے مولانا خلیل الرحمن مستقل ناظم مولوی سید عبداللہ اور مفتی احتشام علی نائب
 ناظم مقرر کیے گئے، ”چوں کہ مولانا صرف ندوۃ العلماء کی بہبودی اور اصلاح کے خوشگوار
 تھے اس لیے اس ایک سوچی میں ان کو ندوۃ العلماء کے فوائد نظر آئے۔ مولانا کے استعفیٰ
 کی خبر جب طلباء کو معلوم ہوئی تو ان کو سخت افسوس ہوا ایک جلسہ کر کے نارہجیہ فردا
 فردا خط لکھے لیکن مولانا نے عہدے کی ذمہ داری لینے سے انکار کیا لیکن اقرار کیا کہ
 معمولی رکن کی حیثیت سے زندگی کا مقصد دوسرے کی خدمت ہو (۶۴۹) ۱۲ جولائی

کو طلباء کے نام ایک خط لکھا پھر مدرس اعلیٰ مفتی عبداللہ صاحب ٹونجی اور حضرت
 دبیرین کے جواب میں خط لکھا ”آپ صاحبوں کی ہم درودی اور قدردانی کا شکریہ ادا
 کرتا ہوں لیکن فرمائیے چارہ کیا ہو؟ پورے چار برس گزرے بجز اس کے کہ ہر کام
 میں میری مخالفت کی گئی اور کیا ہوا اس بنا پر میں ندوے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں
 ایک برس بھی آزادی سے کوشش کر سکتا تو ندوے کو کچھ ترقی دے سکتا اس لیے
 بہتر ہو کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں ممکن ہو کہ وہ مجھے اچھا کر سکیں بہر حال میں
 مدرسہ اور طلباء کا ویسا ہی خدمت گزار ہوں گا“

اب مولانا دسمبر کے دوسرے ہفتے میں لکھنؤ آئے طلباء نے خیر مقدم کا جلسہ
 کیا مولانا نے تقریر کی دسمبر کے آخر میں آخری سال کے بڑکوں نے مولانا سے
 درس بخاری کی خواہش کی اور بعد مغرب ہر روز یہ درس شروع ہو گیا مگر ناظم کے
 حکم سے مدرس اعلیٰ نے خارج اوقات میں طلباء کو کسی سے بھی درس لینے کی مخالفت
 کر دی، طلباء ہر سال کسی نہ کسی تاریخ میں بیان سیرت کی مجلس کرتے تھے اور مولانا
 تقریر کرتے تھے اس سال بھی اہتمام شروع ہوا اور مولانا کی تقریر کے خیال سے روکنے کی
 کوشش کی گئی لیکن پھر بعد کو عام بدنامی کے ڈر سے مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اس
 کی منظوری دے دی گئی اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جو طلباء میں ہیجان کا باعث
 بنتے گئے جن میں سے ایک طلباء کو سیاسی جلسوں میں شرکت سے جکڑا باز رکھنا بھی تھا
 آخر ۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو مولانا کی ہر قسم کی ہمائش کے باوجود طلباء نے اسٹرائک کا
 عام اعلان کر دیا۔

جماعت احرار نے جن کے (بقول مصنف) شیخ طریقت مولانا ثبلی تھے اور ان
 کے اخبارات نے طلباء کی حمایت کی قدامت پسند گروہ جن میں اس وقت صاحبزادہ
 آفتاب احمد خاں نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے ندوہ

کے کارکنوں کی حمایت میں تھا مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنان مدارس کی ہم دردی کے نام سے علی گڑھ کالج کے ارباب اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے اور یہ تصادم ملک کے طول و عرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم رہا، اسٹرائک کے اعلان کے ساتھ مولوی معوذ علی ندوی اور بعض طلباء نے قدیم سنے اسٹرائک کی رہنمائی کی رہنے پہنے اور تعلیم کا بھی انتظام کیا، اخبارات و رسائل اور چھپوٹوں کے ذریعہ رائے عامہ کو ابھارا، مولانا نے استغفا دینے کے ساتھ اپنے ہم درو احباب اور شاگردوں کو اسلحہ ندوہ کی طرف متوجہ کیا تھا ان ہی میں سے بعض خطوط کو ڈاک سے اڑا کر دفتر نظامت ۲۶-۲۷-۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور اخبارات میں شائع کرنا اور ثابت کرنا چاہا کہ اسٹرائک ان کی سازش سے ہوئی مولانا نے اصلاح کی تحریک کا علی الاعلان اعتراف کیا، اپریل ۱۹۱۹ء کے مقام بخنو مجلس اصلاح ندوہ قائم ہوئی اور تمام ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، ہندستان کے مختلف صوبوں اور شہروں بلکہ قصبات و دیہات میں تقریباً پچاس جلسے مطالبہ اصلاح کی تائید میں مسلسل منعقد ہوئے (خلاصہ ۶۴۸ تا ۶۵۵)

ان واقعات کے بیان کے بعد لکھتے ہیں کہ ”اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا تصور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا انھوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم انسان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور و شور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف ندوہ کا شور برپا ہو گیا“ (۶۵۶)

مصنف حیاتِ شبلی نے اصلاح تحریک کے اعتراف کے ضمن میں صفحہ ۶۵۵ پر حاشیے میں صرف مولانا شبلی کے ایک مضمون کا حوالہ دیا، جو کہ ”اسٹرائک کا سبب کن تھا“ جو اسی زمانے میں اختیار ہم دود میں اور بعدہ مقالاتِ شبلی جلد ہفتم میں شائع ہوا۔

دوسرا حوالہ مولوی عبدالسلام کے ایک خط کا مع جزری اقتباس ہو جو انھوں نے ۲۵ جولائی کو مولانا کے استعفیٰ کے بعد اپنے ہم سبق دوست مولوی مسعود علی کو لکھا تھا کہ اب خاموشی کا وقت نہیں مختلف مقامات میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو اظہارِ اخوس اور ندوہ کے موجود تھا ہے مینائی کے جلسے کرائے سرکشی اور اسٹراٹیک کا وقت اب آیا ہو اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو مولانا کا حکم ہو یہ خط بھی دفتر نظامت ڈاک سے اڑا دیا مولانا نے اس خط کے متعلق بہ حلف اپنے مضمون میں لکھا کہ ”نہ یہ خط میرے ایوان سے لکھا گیا ہو نہ میں نے اس کو دیکھا ہو اور نہ میں اب بھی اس کو جائز سمجھتا ہوں“ مولوی عبدالسلام نے اس خط کو اپنا قبول کیا مگر یہ لکھا کہ ”میں نے مولانا کے استعفیٰ کی منظوری کی خبر سے مضرب ہو کر لکھا اور مولانا کی طرف اس لیے نسبت کی کہ طلباء میں اس سحر یک کی اہمیت بڑھ جائے“

مصنف نے اس پورے تذکرے میں یہ بیان نہیں کیا کہ طلباء نے جلسہ خیر مقدم میں ایسی نظمیں پڑھیں اور تقریریں کیں جن میں موجودہ نظامت پر حملہ تھا لیکن مولانا نے ان طلباء کو اس مذموم حرکت پر منع نہیں کیا۔

جلس بیان سہرت میں یہ قیود لگائی گئی تھیں کہ بجز مولانا کے کوئی تقریر نہ کرے اور اگر کوئی طالب علم نظم پڑھنا چاہے تو پہلے مدرس اعلیٰ کو دکھائے۔ یہ واقعہ خود مدرس اعلیٰ مفتی عبداللہ ٹانگی نے اپنی رپورٹ میں درج کیا ہو مگر مصنف ان قیود کو بیان نہیں کرتے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ ناظم کے قبضے میں ایک خط تو مولوی عبدالسلام کا تھا اور دوسرا خط خود مولانا شبلی کا مولوی مسعود علی کے نام مورخہ ۱۶ اکتوبر تھا جس سے مولانا نے انکار نہیں کیا۔ اول الذکر خط کی نسبت اس یقین کی کافی وجہ تھی کہ مولانا کے حکم سے اسٹراٹیک اور لکھنؤ کی تحریک ہو کیوں کہ وہ بمبئی سے آیا تھا اور کاتب خط مولانا کے پاس دفتر سہرت میں کام کر رہے تھے مولانا نے اپنے خط میں اصلاح کے

۱۱۔ پیر باقاعدہ لکچریشن جلسوں اور مناظروں کی رہنمائی ایسے طالب علم کو کی جاتی تھی جن میں تنظیمی کاموں کی فطری صلاحیت تھی اور بن کا نواح لکھنؤ میں کافی اشن تھا اس لیے طلباء کو ان کے دست بوسے روکنا ضروری تھا مگر مصنف نے ان واقعات کو مخفی رکھ کر دوسرے بناری روکنے کا الزام قائم کر دیا۔

طلباء کے میکان اور اسٹرٹنگ کے بیان میں یہ نہیں دکھایا کہ اصل وجہ ایک طالب علم کا اخراج تھا جس کو درجہ تعلیم میں ۱۲ ضروری سکولز کے اساتذہ اور مدرس اعلیٰ سے برتری دیا گیا اور ترقی کی وجہ سے یہ سزا دی گئی تھی۔ سیاسی جلسوں میں طلباء کی شرکت اس زمانے میں تو کہیں بھی جائز نہ تھی اور اگر یہ وجہ ہوتی تو حکم مانوت کے بعد ہی اسٹرٹنگ ہو جاتی یا طلباء اس پر احتجاج کرتے۔

مصنف نے اس امر پر بھی روشنی نہیں ڈالی کہ جب مولانا نے مدرس اعلیٰ وغیرہ کو کھل دیا تھا کہ اچھا ہوا کہ اور لوگ کیسوی سے کام کریں تو استغنیٰ کی منظوری کے بعد ایک مہینے کے اندر ہی جدید نظام کے خلاف لکچریشن اور اخبارات میں مضمون نگاری کی ہدایات (جو خود مصنف کو بھی بہت زیادہ دی گئیں۔ اور وہ خطوط مند رہے مگر قابل میں موجود ہیں) کو ناسمجہ رہتا تھا، نہ اس امر کو واضح کیا کہ مولوی عبدالسلام کے خط کی اشاعت کے بعد چھ مہینوں تک مولانا کیوں خاموش رہے، ۱۶ اکتوبر کو مولوی مسعود علی کو جو ہدایات بہ طور ایک اسکیم کے دی گئیں ان میں مضمرات قلبی کیا تھے۔

مصنف نے ابوالکلام آزاد کے آتش ریزہ قلم اور نفخ صور کی جی کھول کر داد دی ہے لیکن اپنے مسلسل مضامین کو ذکر نہیں کیا جو اخبار رکیل وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ مولانا آزاد کی نسبت مصنف نے ۶۰ صفحات ۴۴۴۴ میں لکھا ہے کہ وہ مولانا کے تربیت و صحبت یافتہ تھے اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہم پری جس صحبت کا فیض تھا وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہو۔ خود مولانا نے بھی اپنے

خط میں ان کو اپنا "عالم السوائر" لکھا ہے مگر ان کے آتش ریز قلم کی آتش فشانی کامیاب نشانی میں کوئی نمونہ نہیں دیا یہاں چند نمونے پیش کرنے کے قابل ہیں :

(۱) "جس جماعت کی شریعت پر حق اور مدین اور تقدس کے احکام اور شرع کے خلاف یہ حال ہو کہ آج آج اسے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ اسٹرائک شرع کے خلاف ہے۔۔۔۔۔ وہ مذکورہ سر سے لے کر پیر تک اس کا وجود و شریعت کی توہین اور تقدس کے احکام الہیہ کی تذلیل و طلبا کی استراکب کو خلاف شرع قرار دینے کا اپنے تئیں اہل سمجھتا ہے" ۸ اپریل ۱۹۱۷ء

(۲) مجلس کے وجود پر اعتراض کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ "وہ قطعاً عجیبانہ خواہش ہو کیوں کہ جبل و فساد دونوں کا مجموعہ جو ایک طرف تو اس کو دیکھ کر ان ہمتوں کی بے وقوفی پر ہنسی آتی ہو جو ایک عظیم الشان مجلس کو چلانے اور قائم رکھنے کے وہم میں گرفتار تھے مگر انہیں اتنی بھئی خبر نہ تھی کہ دنیا بھر میں ہمسایوں اور جماعتی کاموں کے اصول کیا ہیں دوسری طرف ان کے اس فساد و شہر عظیم پر متعسف ہونا پڑتا ہو کہ کس طرح قوم کی عظمت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مذہم کے سہم سے ایک سرمد و بحیات و عمل کھینچ لی اور پھر اس کی بے جان لاش پر گدوں کی طرح گر کر پیچھے مارنے لگے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۱۷ء۔"

(۳) خاص ناظم صاحب کے متعلق جن کے اخلاص و حق نیت کا مصنف بیان کیا کہ اعتراف ہو ارشاد ہوتا ہے "کذب : بانی باطل اندیشی مکر و جیل فریب و دسائش کا ایک پورا مجموعہ وہ رپوٹ ہے جو ۲۶ مارچ ۱۹۱۷ء کے جلسہ انتظامیہ کے ذمہ دار ناظم مذکورہ نے شائع کی ہو (۱۲ اپریل ۱۹۱۷ء)۔"

ناظم نوٹس انجیل کا خطاب دے کر فرماتے ہیں کہ "چنانچہ حضرت کلانتا انیس اور انفاق مال کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ جب تک نظامت پر قبضہ نہیں ہوا تھا اور

وقت تک سرفہ اسی کا رہنا تھا کہ نہ دوسے کو کچھ نہیں ملتا لیکن ناظم ہونے کے بعد بڑی مصیبت یہ آگئی کہ جو کچھ بچی بچائی ہوئی پونجی غریب کے پاس رہ گئی تھی وہ بھی اب اس لکھ پتی ناظم کی راہ فتح یابی میں قربان ہو رہی ہو، (۸ اپریل ۱۹۴۷ء) خلافتِ قاعدہ محاسن و مجامع خلافتِ اصولِ نظم عمومی خلافتِ قانونِ ندوہ بغیر ہیچ گوئے مناسبت و اہلیت ایک شخص ناظم بن بیٹا دوسرے کو مددگار بنالیا امیدوں کو بشارت اور آرزوؤں کو پیغامِ فتح یاب ملا جس کی ایک نظر ہر کی آرزو میں اہاساں بسر ہو گئے تھے اب بے غل و غش زاہدان کہن سال سے ہم کنار وہم آغوش تھا۔

۵۰ دینار شد میسر و بوس و کنار ہم۔ از بختِ شکر دارم و از روزگار ہم۔... حقیقت یہ ہو کہ اس گروہ کے افساد سے زیادہ اس کی نادانی قابلِ گریہ ہو، وہ جو کچھ کر رہا ہے اس سے اس کا پہلا مقصود اپنی غرض پرستی اور دوسرا مقصود ندوہ سے اصلاحِ تجزیہ کے عنصر کو خارج کرنا ہے وہ شہرت کے لیے بھوکا پیاسا ہو اور نامِ دہری کی ہوس سے پاگل ہو گیا ہو جہل و نادانی نے اس کے نفس پر یہ القائے باطل کر دیا ہو کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لیے نہ تو علم و فضل کی ضرورت ہو نہ تزکیہ و تنزیہ افکار کی نہ خدمت کا سچا و لولہ آئینہ ایثارِ نفس کا کوئی نمونہ (۱۱ مارچ ۱۹۴۷ء)

یہ چند اقتباس مشتمل نمونہ از خروارے ہیں اور قلمِ آتش ریز سے یہ انگارے مولوی خلیل الرحمن پر ہی نہیں (جن کے حسنِ نیت اور اخلاص کے مصنف معترف بھی ہیں) بلکہ دیگر ارکان پر بھی مثلاً حکیم سید عبدالحی اور مصنف کے الفاظ میں بزرگ و ثقہ مخدوم مولانا شیروانی مولانا احمد علی صاحب محدث میر مٹھی وغیرہ پر بھی ہیں جن کے ارکان کے ہر کارروائی کی روداد پر جو ناظم نے بہ طور رپوٹ شائع کی دستخط ثبت ہیں۔

مصنف نے اسٹرائک کے متعلق مولانا کا دامن صاف بچا دیا ہو اور ان

کے ایک مضمون کا حوالہ دے دیا ہو، حالاں کہ اس سلسلے میں اس کا اقتباس نہایت اہم تھا۔ اس مضمون کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہو ”حقوق طلبی کی جو عام ہوا چل رہی ہو اسٹرائک کے جو عظیم الشان واقعات علی گڑھ اگرہ لکھنؤ میں پیش آچکے ہیں حریت اور آزادی کا مذاق جو عام ہو رہا ہو (صحیح ہو یا غلط) لیکن کیا اس سے کسی درس گاہ کے طلباء بے اثر رہ سکتے ہیں آپ جس کو اسٹرائک کہتے ہیں وہی چیز دوسروں کی نظر میں حقوق طلبی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہو تاریخوں میں پڑھ کر کہ فاروقِ عظیم کو عین ممبر پر ایک عامی شخص نے یہ جواب دیا تھا کہ ”اگر تم ٹیڑھے چلو گے تو تلوار سے تمھارے بل نکال دوں گا“ کسی کو یہ خیال تک نہیں آیا کہ یہ اسٹرائک یا بغاوت تھی یہ آزادانہ فقرے تاریخ اسلام کے طغرائے امتیاز ہیں ان حالات کے ساتھ بخاری شریف کے درس اور مولود و مشرعیف کے روکنے پر اسٹرائک کر دینا کون سی تعجب کی بات ہو سکتی تھی۔

لیکن کیا اس طرح مولانا کا دامن پاک رہ سکتا ہو ان کو اسٹرائک کے ارادے کی اطلاع تو یقینی تھی کیوں کہ انھوں نے اقرار کیا ہو کہ ”اپنی نسبت موظمن ہونے کے اندیشے سے بعض طلباء کو اسٹرائک سے روکا“ پھر انھوں نے اس کی حمایت کی اور جب اسٹرائک کے خلاف مضامین شائع ہوئے تو انھوں نے اس مضمون میں اس کے جو اڑکا فتوا دیا، اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا کے محبوب و صحبت یافتہ دوست نے جو انگارے ان بزرگوں پر برسائے مولانا اسی طرح خوش ہوئے جس طرح بچہ آتش بازی سے خوش ہو سکتا ہو، مصنف نے بھی کچھ کہہ داد نہیں دی۔



مسلم یونیورسٹی (تحریک)

ایک عنوان میں لکھتے ہیں کہ ”مولانا شبلی رحیم راج کے تعلق سے اس تحریک کی اندر لہا تا رہنے سے پوری طرح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خواب کبھی ممنون تعبیر نہ ہوگا چنانچہ جنرل سلاطین میں مولانا شیرداز کو لکھتے ہیں کہ ”مرد سے میں پسند لوگوں کو اگر نری پڑھنے کی اجازت دینا اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر نواب حسن الملک کی فرضی یونیورسٹی، لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دس بارہ برس کے بعد یہ فرضی یونیورسٹی جن لوگوں کے ہاتھوں واقعی بن جائے گی ان میں خود مولانا کا ہاتھ بھی شامل ہوگا واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں طرابلس و لبنان کے ہنگاموں کے سبب مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دہلی میں بے حد ناراضی پھیلی تھی اور ان کی زرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھ ہوتی تھی حکام کے سامنے ان ناخوش گوار حالات کا تدارک از بس ضروری تھا اس کے لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالم گیر اسلامی تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو اندر سے اُدھر پھیر دے، یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تھیل تھا، جس کو نے تہہ ہز ہائی نس سر آغا خان جو اُس وقت کے مسلم قومی رہ نما اور انگریزوں کے معتمد تھے آئے بڑھے، علی گڑھ پاڑی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی رہ نمائی کی باگ سنبھال رہی تھی اس کو دوبارہ ہاتھ میں لینے کے لیے بھی یہ تدبیر کارگر ہو سکتی تھی بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا“ (۵۲۰ و ۵۳۱) اس کے بعد چندے کی وصولی کا ذکر کر کے اندوہ (جنوری سلاطین) کا ایک شذرہ منقول ہے جس میں ہز ہائی نس آغا خان کی مدح و ستائش بھی ہے بعدہ مولانا شبلی کی کوششوں کو بیان کیا ہے، نیز ان کی ایک نظم نقل کی ہے جو لاہور کے جلسہ عام میں انھوں نے پڑھی تھی جب کہ ہز ہائی نس چندہ کے لیے ایک ڈیوٹیشن کر پنجاب گئے تھے اور

مولانا بھی ایک رکن کی حیثیت سے معیت میں تھے، اب دیکھیے کہ ان چند سطروں میں کتنی مدلیں اور واقعہ آفرینی ہی، مسلم یونیورسٹی کالج میں تو سال ۱۸۶۷ء سے موجود تھا، سرسید کی ولت کے بعد علی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ہزبائی نس آغا خان شریف سے اس تحریک کے زبردست حامی تھے اور کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں جو خطبہ صدارت پڑھا تھا اس میں اس تحریک کے خدو خاں کو نمایاں کر کے اور یونیورسٹی کی اہمیت جتا کر سرمایہ کے لیے اپیل کی تھی زراں بلند کالج کی توسیع اسی مطمح نظر سے ہوتی رہی۔ شریف میں کونسل ایجوکیشن وغیرہ کی ایک میں کالج میں زیر غور تھیں جنوری ۱۸۶۷ء میں ہزبائی نس پھر علی گڑھ آئے اور انہوں نے ایڈرس کے جواب میں جو تقریر کی اس میں یونیورسٹی کے خواب کی علی تہیر پر زور دیا اسی دوران میں ملک معظم کی تاج پوشی کے دربار دہلی کا غلغلہ بلند ہوا، مولانا محمد علی اور دیگر اصحاب نے تحریک کی کہ اس تقریب کی یادگار میں ایک مستقل سانس کالج بنایا جائے، آنریری سکریٹری نواب وقار الملک نے ان عجاوین کے متعلق ہزبائی نس کو ایک خط بھیجا جو اس وقت فرانس میں تھے ہزبائی نس نے جواب میں لکھا کہ ”میں غور کامل کر رہے، اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک مرکزی تحریک کا آغاز کیا جائے جس کے دائرہ میں دیگر تمام تحریکیں آجائیں اور یہ موجودہ ملک معظم کی تشریف آوری کالج نیز آئندہ سالوں رونق افروزی ہند اور تاج پوشی کی یادگار میں ہو میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے تین مختلف فنڈ کے لیے چندہ طلب کیا یعنی ایک لارڈ منٹو کی یادگار کے لیے اور ایک بادشاہ کی تخت نشینی کی یادگار کے لیے اور کچھ یونیورسٹی کے لیے تو ہماری کوششیں منقسم ہو کر شاید کچھ نہ رہیں۔“

۱۸۶۷ء میں ہزبائی نس نے لکھنؤ میں دو سال کا محاسبہ کیا اور پانسہ پڑا۔

گرائنٹ مذہب کی۔

ہزبائی نس نے فوراً ایک اسکیم اور کمیٹی بنا کر عملی کام کا بھی مشورہ دیا اور پھر ہندستان پہنچ کر کانفرنس منعقدہ انگلینڈ میں عملی کام پر متوجہ کیا اور اپنے عطیہ کا اعلان کر دیا، جنوری ۱۹۱۷ء سے منظم طور پر کام شروع ہو گیا بعض مقامات کے دوروں میں خود ہزبائی نس شریک ہے، علی گڑھ پارٹی سے مراد ہمیشہ سکریٹری اور اس کے رفقاء ہی ہو کالج کے سکریٹری اس زمانے میں نواب وقار الملک تھے اور یہ تسلیم ہو کر اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں وہ اپنی قوم پر بہت زیادہ اثر رکھتے تھے قدیم و جدید تعلیم کے دونوں گروہ اور عامۃ المسلمین ان کے حلقہ قیادت میں تھے اگرچہ ایک دو سال پہلے وہ مسلم لیگ کی سکریٹری شپ سے استعفی ہو گئے تھے اور اس کا مستقر بھی علی گڑھ سے کھنڈ ہو گیا تھا لیکن اس ادارے پر بھی ان کا اقتدار تھا، اسی پارٹی لیڈر کی موت پر مصنف حیات شبلی نے قوم کا ماتم کیا تھا، اس کیوں کر کہا جاسکتا ہو کہ علی گڑھ پارٹی کے ہاتھوں سے وہ نمائی کی باگ نکل رہی تھی۔

طرابلس کا ہنگامہ تو آخر ستمبر ۱۹۱۷ء سے شروع ہوا، حکومت برطانیہ غیر جانبدار تھی مارچ ۱۹۱۷ء میں سلطان المعظم نے ملک معظم برطانیہ کو تحفے اور قلم خاص کا کھٹا ہوا نامہ موت بھیجا ۲۱ مارچ کو ترکی مشن کے ارکان نے باریاب ہو کر یہ تحائف پیش کیے۔

مطلوبان طرابلس کی مالی امداد میں حکومت ہند نے ہر قسم کی سہولتیں دیں، ان واقعات صحیحہ کے ساتھ مصنف حیات شبلی کے آفریہ واقعات پر پھر ایک نظر ڈالی جائے۔ اب اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو لاہور میں مولانا نے پڑھی تھی۔

کنوں دہ سال شد کیں خواب نشیں زلف و ایم کہ خواب اس چنیں خود جان از و جان باشد
 نے پیدا نہ شد اس خواب اپوں صبح تعبیرے گماں بردیم کہیں اندیشہ از رو سے خطا باشد
 دریں بودیم ماکر پندہ گماہ غیب سز باد ہمایون طلعتے کہیں عقد را شمس کشتا باشد

بکثرت شیعہ وسنتی سرآغا خاں غلامیہ و لیکن کشتی اسلامیاں رانا خدا باشند
کنوں بیٹی کہ روز آگ لٹش رنگیں بپا گردو کشتی ہم در یک بلبل رنگیں نوا باشند
مولانا کی کوششوں کے سلسلے میں تحریر ہوئی کہ مجلس تائیس جامعہ اسلامیہ
(مسلم فونڈیشن کمیٹی) کے نام سے قواعد و ضوابط بنانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی
مولانا اس کے بھی ممبر تھے۔ افسوس ہے کہ مصنف نے فونڈیشن کمیٹی اور کانٹری بوشن
کمیٹی میں امتیاز نہیں کیا تائیس اور دستوری کمیٹیوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے پہلی کمیٹی
میں بہت سے ممبر تھے (ڈیڑھ دو سو ہوں گے) اور دوسری میں چند ماہرین تعلیم، جن
میں مولانا کا کہیں نام نظر نہیں آتا، مولانا شبلی کا ہاتھ اس "فرضی یونیورسٹی"
کے بنانے میں عام مسلمانوں کے ہاتھوں سے تمیز نہیں پھر اول مرحلے پر تو وہ نظم نظر
آتی ہے جو لاہور میں پڑھی اور اس کے بعد تو طنز و تظلمیں ہی دکھائی دیتی ہیں کیا لاہور
والی نظم محض ہڑبائی پس کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی اور ندوہ کی مالی و اخلاقی امداد
کی وجہ سے انگریزوں کے اس معتمد کو مسلمانوں کی کشتی کا نا خدا بنا دیا گیا، کیا ضمیر فروشی
کی بدترین مثال نہیں!

مولانا شبلی کی زندگی میں جس طرح یہ نازک
بھنبی اور دستہ گل کا پس منظر ترین واقعہ ہے اسی طرح مصنف حیاتِ شبلی

نے کمال محنت و آفرینی کے ساتھ اور اپنی حیات کے پردہ پر پیش کیا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ع
"مستند میرا فرمایا ہوا" تدلیس کی انتہا کر دی ہے، لکھتے ہیں
میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بھنبی پہلا اور پہلی دستہ گل کی
عطر بیزی اور شام پوری کا زمانہ تھا، دستہ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار
کے پھول "نثار بھنبی کن ہر متاع کہنہ و نو را۔ مولانا کو ۱۹ برس کے بعد غزل
کا کوچہ یاد آیا، "ستمبر ۱۸۷۷ء کو بھنبی سے ہمدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں" ابر

بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا یہاں کی دل چاہی غضب کی حرکت ہیں آدمی ضبط نہیں کر سکتا اپلو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہو اور چو پائی اس کا جواب ہو خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہو ”کنا بر آب چو پائی و گلشت اپلو را“ اس غزل کا شعری ۵ بہ ہر سوز ہجوم دلبران شوبخ بے پروا، گذشتن از سیرہ شعلہ افتادہ پروا (مہدی ۲۶) یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حافی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشم ساقی کی مستی بھی آمیز ہو خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہے۔

اند کے نیز بہ کام دل خود ہیں باشم روزگارے چوم دانش و عرفاں زندہ ام
چند در پردہ توں کہ دشمن فاش بگو سنگ بر شیشہ تقوی زندہ ام ہاں زندہ ام
جامہ زہد چو برق صفت من راست بنو شیشہ تقوی سی سالہ بہ سنداں زندہ ام
آں شملے دوست کہ آراستے پیکر بن نقش زیبا صنیہ بر ورق جاں زندہ ام
آں شملے دوست کہ در ندوہ بینی اہا کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زندہ ام
وہ لوگ جن کی سخن بھی صرف حرفی ہوتی ہو وہ غلطی سے اس دشمن ایمان کی
”لامش بمبئی میں کرتے ہیں حالاں کہ وہ علی گڑھ میں تھا“ یعنی کہ وہ علی گڑھ ٹھہر کر کیسے
اٹک ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے“ یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان و طرز ادا
کی بڑی تعریفیں ہوئیں معاصر شاعر نے جوابی غزلیں لکھیں جو خوش گمان تھے وہ ان کو
نصوت کے رموز و اسرار سمجھے اور مولانا سے دستِ ہیئت ہونے اور ان کے پیر
کی تلاشیں ہونے لگیں جو بدگمان تھے وہ اس وصفِ عنوانی کے افراد کی تلاش
میں لگ گئے حالاں کہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ، بلکہ صرف بمبئی کی خوش سواد و ادب
حسنِ منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا ”خلوط بٹلی کے اوراق میں
یہ سامان نہیں ان کی تاریخ دو برس کے بعد ۱۲۹۷ھ سے شروع ہوتی ہو (۱۳۵۱ھ) (۱۳۵۲ھ)

اب حقائق پر نظر ڈالیے، مولانا شبلی کو سیر و تماشا اور رنگین مہمتوں دل چاہتی تھیں۔ دارفہ مزاج اور حسن پسند تھے جذبہ و عقل کی کشمکش میں جذبہ غالب ہو جاتا تھا پہلی بیوی کے انتقال (۱۸۹۶ء) کے بعد سلسلہ پھر نال اختیار کیا تو نئی بیوی کی تعلیم کے متعلق ہدایت کرتے ہوئے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ حسن صورت کی نوبت ہو چکی میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا اب کوئی چیز مایہ نسیکین ہو سکتی ہو تو صرف حسن سیرت ہو اس کے لیے سب سے مقدم تعلیم ہو۔ (سیح ۱۸۷۸ء مکاتیب) ۱۸۹۷ء میں جب مولانا حیدر آباد سے ندوے میں آگئے تھے اور جائزہ خدمات لے چکے تھے ان بیوی کا بھی انتقال ہو گیا یہ سخت صدمہ تھا جیسا کہ خود کہا کہ ”اس زور سے چیخ کر رویا کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا (۱۸۷۷ء حیات) مروج سلسلہ میں بنارس میں ندوہ کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا اس کے اہتمام کی مصروفیت نے غم غلط کیا اس سے فارغ ہوئے تو طلب حزیں کی تسکین کے لیے وہیں (معبود رام میں) رہ گئے لیکن یہاں اسباب تسکین نہ تھے کمزور آئے اور قرآن مجید کے درس دینے میں بھی جی نہ لگا اور اگست میں بمبئی چلے گئے مصنف حیات شبلی اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ ”مولانا گرمی اور لاؤ تو برداشت کر لیتے مگر برسات کا جنس اور پسینہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس زمانے میں بمبئی میں سمندر کی آب و ہوا ان کو پسند تھی“ (۵۱ ص حیات) مگر مولانا کی زندگی میں اس سے پہلے بمبئی یا کسی پہاڑ اور ساحل سمندر پر اس زمانے میں رہنے کا پتا نہیں، بلاشبہ مولانا دو چار دفعہ بمبئی جا چکے تھے وہاں کی فضا اور دل چہیوں سے حظ اٹھانے کا بھی اندازہ کر چکے تھے اس موقع پر بمبئی ہی غم غلط کرنے اور حظ

۱۷ قاہرہ میں قیصر دیکھنے کے متعلق مولانا اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں ۱۷

گاہ درقاہرہ نہاں بہ تعلقے ہوس بہتیر مشد و در جلوہ گر ناز آمد

اٹھانے کے لیے موزوں ترین مقام تھا یہاں چوپاٹی اور اپالوکی سیر کے ساتھ ایک سرور انگیز صحبت بھی تھی جو ایک معزز خاندان ”طیب جی“ میں حاصل ہوئی۔

سٹر جسٹس بدرالدین طیب جی کے عموزاد بھائی جن آفندی ایک ہنایت خلیق اور ہماں نواز بزرگ تھے ان کا تجارتی کاروبار قسطنطنیہ میں بھی تھا اور جب مولانا وہاں گئے تھے تو جن آفندی نے بڑی خاطر مدارات کی تھی جس کا ذکر مولانا نے اپنے سفر نامے میں بھی کیا ہے۔ اس زمانے میں مع خاندان ممبئی میں تھے ان کی بیگم صاحبہ امیرالنساء ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور مولانا سے پہلے سے واقف تھیں ان کی بہن صاحبزادیاں بھی تھیں (۱) زہرہ بیگم (۲) نازی رقیہ بیگم (۳) عطیہ بیگم۔ زہرہ بیگم پرہیز تھیں ان میں کمال متانت تھی تصنیف و تالیف کتب بینی مضمون نگاری مشغلہ تھا نازی بیگم کی شادی ہربائی نس نواب بہادر خیرہ سے ہوئی تھی اور ممبئی آتی جاتی رہتی تھیں عطیہ بیگم زوجہ جوان دوشیزہ یورپ میں بھی کچھ دن بہ غرض تعلیم رہ چکی تھیں اور شہنشاہ و طرائف تھیں یہ سب نہیں قومی معاملات کے بھی دل چسپی رکھتی تھیں اور عورتوں کی شاعت تعلیم کی مناد تھیں زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم نے علی گڑھ کے زمانے میں سے کے متعلق بھی بہت کام کیا تھا، یہ خاندان تھا جس میں مولانا کا بڑے تپاک و احترام سے خیر مقدم ہوا اگرچہ یہاں علمی و قومی مذاکرات رہتے لیکن عطیہ بیگم کے ساتھ مولانا کو شیفٹلی ہو گئی اور ان کے جذبات میں تلامذہ رہنے لگا یہ مصنف کہتے ہیں کہ ممبئی کی خوش ہوا دی اور حسین مناظر سے شاعرانہ جذبات ابھرے بلاشبہ اس طرح بھی انجرتے ہیں لیکن مولانا کے جذبات ممبئی مناظر اور خوش ہوا دی میں جن انسانی نے اٹھائے تھے کیوں کہ ان کے کلام و مسہ نگار میں زیادہ تر ایسے ہی جذبات پائے جاتے ہیں جو کسی انسان دشمن ایمان کا پتہ دیتے ہیں اور جھٹ سنواری کے افراد کا نشان بتاتے ہیں۔

مولانا حالی نے چشم ساقی کی مستی کی آمیزش تباہ نہیں بتائی بلکہ پوسے چیلے

میں حقیقت غریباں کر دی ہو۔

”کوئی کیوں کر مان سکتا ہو کہ یہ اُس شخص کا کلام ہو جس نے سیرت النعمان الفاروق اور سوانح مولانا رحمہ اللہ جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں غریبوں کا ہے کوہیں شراب و آتشہ جو جس کے نشے میں خمار چشم ساتی بھی ملا ہوا ہو، غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضاہین پر مشتمل ہو ممکن کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل رُبا ہی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔“

و د دل بودن دریں رہ تخت تہ عیب است سالکنا

خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بولے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہو مگر اس شعر سے ہر شخص بھٹک نہیں اٹھا سکتا الا الذی ابتلہ بمثال ما ابتلہ بہ القائل “

مستشف نے اعترافات کا معاملہ آمیز موقع رکھنے کی شہادت میں ایک طویل غزل کے پانچ شعر نقل کیے ہیں اور آخری شعر کے دشمن ایمان کو ”علی گڑھ تحریک“ قرار دیتے ہیں یعنی کہ وہ (مولانا) علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے، اور اس کو بھی میں تلاش کرنے کی حریفی محض کہتی ہو، اور اس صنف غزلی کی افراد کی تلاش بدگمان لوگوں کا کام بتاتے ہیں۔

تعجب ہو کہ مصنف یا ت شبلی نے دھوکے میں ڈالنے کی ایسی کھلی اور لے جا

جسارت کی ہے، مولانا تو اسی وقت (۱۸۹۷ء) میں ندوہ میں شامل ہوئے سبب کہ

علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے اور اگر کانپور کی لازمت سے الگ ہو کر آنا مراد ہو تو

ظاہر ہو کہ مولانا حیدر آباد کی لازمت چھوڑ کر آئے تھے علی گڑھ سے جدا ہونے تو آٹھ

سال گزر چکے تھے علی گڑھ تحریک سے علی گڑھ کاشن مقصد ہو تو مولانا اس سے کبھی الگ

ہیں ہوئے جیسا کہ ان کے اوراق حیات سے ثابت ہو، بلاشبہ مولانا سلطنتِ مملکت میں

وہ سب کچھ کہ گئے ہو کنون فلک خاں تھا اور وار وابت قلبی تھی ان اشعار کو سلسلے وار پڑھیے اور پوری غزل دیکھنے کے قابل ہو جس میں ایک شعر یہ بھی ہو۔

بہیٰ بزمِ مستنزل مقصود و عجبش پیش ازین گام طلب در رہِ حزنِ دہام
اس منزل مقصود پر پہنچ کر شاعر نے دانش و عرفان سے تھک کر دم لیا ہو اور اپنے دل کی مراد نکالنا چاہتا ہو اور یہ بھی دیکھنا ہو کہ اس کے جسم پر جامہ زہد موزوں نہیں لہذا وہ شیشہ نقوی کو سسنداں پر مار دینا ہو اور بے ساختہ کہ اٹھتا ہو کہ اسے دوست وہ زمانہ گیا جب کہ میں پیکرِ فن آراستہ کرتا تھا اب تو ورقِ جاں پر صنمِ زیبائی کی تصویر بنائی ہو اور اب جو چکا کہ تو مجھے دوبارہ (باز ہندوہ میں دیکھے گا کیوں کہ اس دشمنِ ایمان کی صحبت میں مصروف ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہو کہ اس دشمنِ ایمان کا مقام کہاں ہو اور وصفِ عنوانی کے مزاد و اہم ہیں یا حقیقت لیکن اس سے قبل خطوطِ شبلی کی تاریخ بھی سن لیجیے جس میں مصنف کو یہ سامان نظر نہیں آتے اور جن کی تاریخ آغاز دو برس بعد سن ۱۲۹۷ء قرار دی گئی ہو۔

حادثہ لوگوں کے پاس سلسلے وار خطوط محفوظ نہیں ہوتے اور نہ ابتدائے مراسلت وقت پر جب تک کہ خاص اہتمام نہ ہو ان نگینات (زہرہ بیگم و عطیہ بیگم) کے پاس بھی ابتدائی خطوط محفوظ نہ تھے لیکن ہم کو اس مجبوری کے پہلے خطوط سے ہی سن ۱۲۹۷ء سے قبل کے تعلقات صاف معلوم ہو جاتے ہیں۔

(۱) بحیرہ کے سفر کا جو موقع جاننا رہا اس کا افسوس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے، ہمت نہیں ہوتی ورنہ یورپ کے سفر کا اچھا موقع تھا..... ندوہ کے انگریزی کاغذات زہرہ بیگم صاحبہ کو دے آیا تھا کہ تم کو دے دیں..... اگر اس خط کا بواب آیا تو بہت سی ضروری باتیں تم کو لکھنی ہیں۔ (۲۷ فروری سن ۱۲۹۷ء)

(۲) بے خبر خیرہ نہ آئے کامیج، لیکن اس خیرہ کا آنا یقینی ہی اس نہ ہی پھر ہی
یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں ممکن ہو کہ ہمت پیدا ہو اور ساتھ چلی سکوں۔
(۲۳ فروری ۱۹۹۷ء)

اب دشمن ایمان اور اُس کے مقام کو وصفِ عنوانی کے افراد کی حقیقت کو
خطوطِ شبلی اور مکاتیبِ شبلی میں دیکھیے۔
خطوطِ شبلی بنام عطیہ بیگم (۱) اہلاً و ہلاً عزیزِ ایک بے ریاد دل ایک غص
دل وفا شعار دل کی طرف سے مراجعت کی مبارک باد قبول کر دے، میری زندگی
کا یہ سخت افسوس ناک واقعہ ہو کہ یہ مبارک باد میرے لب کی بجائے دباں قلم اور کرنی
ہو۔ واقعات ایسے ہیں کہ ایک دن کے لیے یہاں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔

جنینت کی غزل الگ مُرسل ہو جس کے ساتھ ایک ہنایت حقیر ہو ہو کیا تم
ان دونوں چیزوں کو قبول کر سکتی ہو؟ ہنشاہ ایڈورڈ اور پریڈنٹ فرانس کا معزز
ہاں اس قدر اپنے رتبے سے اتر نہیں سکتا، ہاں یہ سچ ہو، لیکن باد کو آغاب دے
پر بھی چمکتا ہو میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی تصویر جو نہیں برس کی عمر کی ہو اتفاق سے
ہاتھ آگئی ہو بھیجتا ہوں وہ میری قائم مقامی کرے گی آؤ، ایک مرتبہ پھر تم کو مبارک باد
دے لوں، جناب نواب صاحب بہادر اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں مبارک باد اور
تسلیم۔ ۷ اکتوبر ۱۹۹۷ء

(۲) اب گم شرا سے می نویسم کہ خاتم غبار سے می نویسم
مختار خطِ بدت کے بعد ملا تو بے ساعتہ میں نے آنکھوں سے لگا لیا اور دیکھ
سے افسوس ہو کہ راقم نے خطوطِ شبلی کو شائع کرتے ہوئے جب دیا پھر کھا تو مکاتیبِ شبلی کے خطوط
موسومہ ہمدی افادی و موثق حیات حبیب الرحمان خاں شیر والی (نواب صدر یار جنگ بہادر)
پیش نظر نہ تھے۔ بلکہ ملاحظہ ہو خط موسومہ ہمدی اکتوبر ۱۹۹۷ء

بار بار پڑھتا رہا، انوس دیر تک ملنے کی اُمید نہیں میں وطن احباب آرام سب چھوڑ
سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیوں کر چھوڑ دوں ورنہ بھئی یا جزیہہ دو قدم
پرستھے۔ (۲۸ اپریل ۱۹۰۹ء)

(۳) اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہو میرا ہر روز لکنا اور ہر موسمے بدن تمہاری
تقریبات اور توصیف کا ایک شعر ہو تم کہتی ہو کہ میں ”بد ہمت“ ہوں میری زندگی کے
دو حصے ہیں سپانیوٹ اور پبلک اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا
اندازہ کر سکتیں تم کو کیا معلوم ہو کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں تم کو کیا معلوم ہو کہ میں اگر عدم
کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک ہنایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔
(۱۹ اگست ۱۹۰۹ء)

(۴) شوق تو از گجا بہ گجامی بد مرا نزدیک شد کہ گردہ کاواں شوم
یا بھئی رسیدہ ام و زود تر بود گز بھئی بہ سوسے جزیہہ رواں شوم

(۳۰ نومبر ۱۹۰۹ء)

ان خطوں کے بعد بے تکلف دوست ہمدی اور نہایت ثقہ دوست ہوشیاریا
کے نام جو خطوط ہیں ان کے چند اقتباسات بھی سلسلے وار ملاحظہ ہوں اور یہ وہ سالان
ہو جس کو قابل مصنف حیات نے جمع کر کے بیلک کے سامنے پیش کیا ہے۔

مکاتیب بنام ہمدی حسن افادی

(۱) ۱۳۵۷ھ - ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء - اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے

دیکھیے گا، البتہ جاہ جاغلط چھپی ہو ”کافروں“ کا ذکر اس میں بھی ہو۔

(۲) ۱۳۵۷ھ - ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء - بھئی میں بڑی دل چسپیاں ہیں جو موزوں ہو کر قلم سے

نکلیں ۱۶ صفحے ہو گئے تو چھپنے کو دے دیے اس میں کچھ پچھلے سال کا بھی

حصہ ہے بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں جو شاید ایک پنجاہ سار مصنف کے چہرے

پر نہ کھلیں لیکن حافظ تو لکھتے ہیں عہدِ برگہ کہ یادِ روئے تو کردم جواں شدم۔
اور ایک بڑا ناخوشگوار لکھتا ہے عشقِ درہنگام پیری چوں بہر آتش است
کیا یہ فلسفہ صحیح ہو۔

(۲) ۱۷۷۳ء جولائی سن ۱۱۹۷ھ بمبئی کی زندہ دلی "میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس پر نوٹس لیا
ہوگا آج یقین ہو کہ چورہ گیا نما، جس رخ کی آپ نے بشارت دی ہو نئی نہیں،
ولایت ان فاختوں کا جولاں کاہ رہ چکے ہو یورپ بہ اس تہذیب سال بھریں
ایک دن باگل ہو جانا، بمبئی کے دن اسی دن کے سلسلے میں شامل ہیں۔

(۳) ۱۷۸۰ء اگست سن ۱۱۹۷ھ شعر الجم کا دوسرا اور تیسرا حصہ بھی قریب الختم ہو ۲۲۷
صفحوں کی کتابیں بھی مطبع سے آچکیں، اور لکھتا لیکن ایک جنس لطیف کا
خط سامنے ہو اور جواں بختیاری اس فرعونیت کو دیکھتے کہ ان شاہنشاہوں
کو بھی ابدِ اعراب نہیں لکھتا پھر آپ کو شکایت کا کہا موقع

(۵) ۱۷۸۵ء اکتوبر سن ۱۱۹۷ھ حال میں خیر مقدم لکھا ۹ اکتوبر کو لوگ بمبئی آگئے لیکن
خیر مقدم میں جہاں جہاں پہلی رنگ اُبھرا تھا ان پر سیاہی بھر دی وہ شہر پہ
بھی مٹ گیا

شیشہ بٹے دلِ عشاق چسپید کہ گزشتہ رمد اور درتہ پامی آید
مزنید آب بہ خاکِ برونش کیس کار شیوہ ہست کہ از دیدہ می آید

(۶) ۱۷۸۵ء ۲۴ نومبر سن ۱۱۹۷ھ بمبئی کا مہمان آج کل حُسنِ اتفاق سے ہیں، جو یہ لفظ یعنی
اس کا پہلا جز کہی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوگا لیکن بد قسمتی
دیکھیے کہ ندوہ کے بد مزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا، جو کہ ایسے
موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، نہ وقت نہ دماغ حسرت کا بھی اس سے
بڑھ کر منظر دینا نے نہ دیکھا ہوگا ان صحنوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز

پہلو نظر سے گزر رہے ہیں اور دو فارسی انگریزی فرنج زبان دینی مصوری
نقشہ کشی پائیکس قوت تحریر و انجہ عالم بہرہ می داشت تو تھا داری -
انوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی در نہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں
(۶) ۵۳۵-۱۱۲۰ میر تقی میر (مجموعہ) ، ندوہ کے بد مزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا

کام کب کرنے دیا کہ کچھ دیکھتا دکھاتا اب تک وہ نہار نہیں اترا سو طرح
چاہتا ہوں کہ اس دام سے دو دن کے لیے بھی دور رہوں لیکن اور زیادہ
اُلجھ جاتا ہوں ، ترکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جال کی رائے بالکل
عام دنیا کے مخالف تو یہاں بھی یکسانی کی شان ہو ان کا خیال بلکہ بھڑے بادشاہ
ہو کہ ترکی ایک یورپین طاقت کا باز کچھ ہو اور یہ چلیاں صرف بیرونی خاموشی
پر حرکت کرتی ہے جدید فرض لے اپنی جانشانی کا کام انجام دیا ہو اور دیتا جاتا ہو ،
لیکن باوجود اس "عبودیت" کے اس مسئلے میں میں اب تک صاحبِ ایمان
ہیں ، یہ ضرور نہیں کہ "سیاست" اور "حُسن" کا ایک ہی فرماں روا ہو

(۸) ۵۳۵-۳۲۰۰ مکرئی آپ میر کے جن دوسرے پوٹیکل خیالات کے
قدرداں ہیں اور جس کا حالہ آپ نے ترکی کے موجودہ انقلاب میں دیا تھا اس کے
ایک خط (جو ابھی میرے پاس آیا ہے) کے یہ الفاظ ہیں "کافر فرس اور علم لیگ
سخت ڈھکوسلے ہیں ہندو اور جاہل لوگوں کے انگریز جس قدر مسلمانوں کو
بناتے ہیں اسی قدر یہ بننے چلے جاتے ہیں اصل تحریر محفوظ ہے کبھی موقع ہو
تو دیکھیے گا -

عبدالحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کے پائیکس کے ادراک کا تاش
کھیلا ہو اس کی اور نیگ ٹرکی کی نسبت میرے دوست کی رائے صحیح ہو
تو شاید کم وقعت فرقہ جدید ہند کی نسبت بھی اس کی رائے قابلِ وقعت

ہوگی میں تو یہ خدا ان فحشوں پر ایمان رکھتا ہوں گو "کافر" کے منہ سے نکلتے ہیں۔
(۹) عہدہ دکن کی "بکلی" پھر کھنڈ پر گرنے والی ہو۔

(۱۰) ۱۷ ستمبر ۱۹۰۹ء - آپ کے احرام جدید کی داودوں یا رشک کڑوں میں
بہی جاتا ہوں شرط یہ ہو کہ خود گاڑی تک آکر لو جائیں کچھ ایسی بڑی بات
ہیں کوئی کیوں رشک کرے۔

(۱۱) ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء - ندوہ کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا اور اب چاہوں تو
ایک آدھ ہینے باہر رہ سکتا ہوں الہ آباد بلائیے تو آجاؤں لیکن شرط یہ ہو کہ
بہی کا نعم البدل نہ ہی، برابر سراپہ تو ہو کیا امید ہو سکتی ہو۔

(۱۲) ۱۳ دسمبر ۱۹۱۴ء - قرآن میں ہو کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیے گئے لیکن کیا
۵ دسمبر ۱۹۱۴ء کے بعد بھی جس دن کہ ایک یہودی کو ہاتھ آئی
شہرہ کیا گیا ہو کہ وہ مسلمان ہو گیا اس لیے تو نہیں کہ ۶ میں ہو کا فر تو وہ
کافر مسلمان ہو گیا، خیر ۶ سبہ رات تار کر دست و کند،

خطوط بنام حبیب الرحمن شیردانی

(۱۳) ۲۶ فروری ۱۹۱۵ء - اب کے بہی میں عجب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عالم لطف
میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت ہے یہاں آنا پڑا لیکن آنکھوں میں اب تک
وہ تماشا پورہ ہو خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نشانہ کر سکتا
ہوں اور بے شکست کر سکتا ہوں۔

سلطہ اگرچہ اصل میں نقاہا ہیں لیکن یہ فقرہ عطیہ بیگم اور ان کے شوہر کی طرف (جو قبل شادی مسلمان
ہو گئے تھے) صاف اشارہ ہو۔ مولانا کا یہ شوہر بھی کہ سہ بتا بنہ کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کہ،
عطیہ کی ہر وقت آج ایک کافر مسلمان ہو، اسی واقعہ کا منظر ہو، شادی کے بعد یہ جوڑا یورپ کی
سیر کو روانہ ہو گیا اور مولانا کا خوشی میں سرور چکا گیا۔

(۲) ۱۷۷۵ء میں مراد علی ترسا زادے بمبئی کے ایوانِ اہل کے مجموعے طلسم میں سچی تصویریں الگ ہیں عوامی بھی ایرانی بھی اور خال خال ہندی بھی۔

مولانا کی طبیعت و مزاج کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہو اس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباسات سے ہو گیا ہوگا لیکن چند مزید اقتباسات اور بھی قابلِ ملاحظہ ہیں پہلا اقتباس ثقہ دوست موئن بیات کے نام کے ایک خط کا ہے اور باقی مولوی ابوالکلام آزاد کے نام کے خطوط کے ہیں جو مولانا کے صحبت یافتہ اور عالم السرائر میں اور جن کی محبت کا رکھنا مددہ نے ایک الزام قرار دیا تھا۔

(۱) بمبئی کے ایک آدھ شعر حاضر ہیں طرح جو شی را فراموشی را
نیگری بہت کہ جن کہ آں رنگِ مست بہم آہنختہ ہمشیری و درہوشی را
من فدائے بت شوئے کہ بہ کجا اہل بہن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
میں نے تو ایک خیالی بات لکھ دی لکھنؤ کے ایک صاحب کے سامنے اخیر کا شعر پڑھا تو کہنے لگے کہ اس کا لے کے پروفیسر ہیں مل سکتے ہیں ۱۷۷۵ء ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء۔

(۲) انساں بہ درد گرہ بر نماں گرفتارم کہ شیوہ ہائے ترا با ہم آشنائی نیست
بجائی تم نے دانستہ خط کتابت ترک کر دی ہو کہ الیاس احمدی الراجستنی
لیکن تم رہ کر ایک چکر کا لگا دیتے ہو خیر جو مرضی یہ بھی منظور رکھتے کیا ایک خاص کام
نہا مولوی مشرف الدین کے ہاں بٹیرا دل چسپیوں کی نئی راہیں نکھیں لیکن ۴

چہ خطِ حضور برد از عس سحر باداں نہا ۱۷۷۵ء ۱۵ جون ۱۹۷۱ء
(۳) بے شبہ میری خواہش ہے کہ چند روز دنیا سے الگ بسر کروں ایسی حالت
میں ایک تصنیف بھی انجام پائے لیکن متصل دن رات تو وحشت کدے میں بسر
۱۷۷۵ خط ۱۷۷۵ء ۱۴ نومبر ۱۹۷۱ء بکاتیب شبلی

۱۷۷۵ بہ نخیل یا بہ جب -

ہیں ہو سکتی شیعوں کے علی فلسفے کی کوئی صورت پیدا ہو تو البتہ ممکن ہے ۵۰۰ ہجری
(۴) ہرج کی پڑنا ہو جائے تو کیجیے گا ہاں ایک روایت مبنی کہ ماہ تمام بنگال
کے افسر پر بھلا لاش سے شاید پتہ لگ جائے ۱۰ دسمبر سن ۱۹۹۷ء

(۵) برادر امیچا کہیں نہیں جادوں گے جندہ رافراں نہ باشد ہرچہ فرامی برآم
لیکن کیا شلی کو رابعہ کا درجہ مل سکتا ہو لیس الذکر کا لاشی، ماسٹر دین محمد وطن
گئے تھے اور سخت جاں گزرا خبر لائے یعنی بدو کمال حیدر آباد سے دلی پہنچ کر غروب
ہو گیا مرتبہ ابراہیمی کہاں سے لاؤں کہ لا احب الا خلیں کہ کوں ملے ۱۵ اکتوبر سن ۱۹۹۷ء
مصنف نے صفحہ ۱۱۸ پر لکھا ہے کہ 'نواب صاحب جزیرہ (جنجیرہ) اور ان کا
پورا خاندان مولانا کا شہیدائی تھا چٹاں چھ جب بھئی جاتے تھے تو اکثر ان لوگوں سے
ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں، ایک بار اکتوبر سن ۱۹۹۷ء میں خود جزیرہ اشرفیہ لے گئے
تھے۔ مگر یہ نواب صاحب جزیرہ کا خاندان نہیں تھا بلکہ حسن آندھی کا خاندان تھا۔
اور مولانا سلفیہ میں نہیں سلفیہ میں جزیرہ گئے تھے، اس سفر کی دو نظمیں جن کو
کلیات میں دینا نے دو م کا خلعت عطا کرنے میں بخل برتا گیا ہے پڑھنے کے قابل ہیں۔
بمقام جزیرہ :-

کسی کو یاں خدا کی بسجھو ہوگی تو کیوں گی	خیال روزہ و منکر و منکر ہوگی تو کیوں ہوگی
ہولے رُوح پر و خودیاں کی نشہ آور ہو	یہاں نکر و جام و سہو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دودن بھی بسر کرے گا اس قصہ مٹی میں	اے خلبہدیں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
خواب نازنی بیگم کو اور نواب صاحب کو	کسی مٹی کی بدوں میں آرزو ہوگا تو کیوں ہوگی

کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستان

تھی یہ تم کو یاد رکھو ہوگی تو کیوں ہوگا

۱۱۷ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے

مراجعت کے بعد ہی ۱۷ اکتوبر کو دوسری نظم لکھ کر بھیجی اور حق تو یہ ہر کہ مولانا کی اردو نظموں میں یہ نظم لائنائی ہو۔

یادِ صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں ہیں وہ جزیرے کی زمیں مٹی یا کوئی موحنا نہ تھا
 لطف تھا ذوقِ سخن تھا صحبتِ احباب مٹی مطرب و رود و سرود و ساغر و پیما نہ تھا
 سبزہ و گل سے بھرا تھا دامنِ کُساں سب غیرتِ خلد ہیں ہر گز مشہ ویرانہ نہ تھا
 چنچہ نگل کا تہنم تھا ہر اک دم برقِ ریز عندِ لبوں کی دہاں پر نعرہٴ مستانہ نہ تھا
 نشہ آور مٹی نگاہِ مستِ ساقی اس قدر خود بہ خود لبِ ریز می ہر ساغر و پیما نہ تھا
 اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ نہ تھا

آپ اور پرچہ آئے ہیں کہ مولانا نے مثنوی صبحِ امید کو اپنی تصنیف کے خارج کر دیا تھا اور بعض نظمیں اس لیے کلیات میں جگہ نہ پاسکیں کہ طبعِ غبور پر بارِ محقق تاہم مصنف حیاتِ شبلی نے مثنوی کو کلیاتِ اردو میں اور طبعِ غبور پر بارِ والی نظموں کو حیاتِ شبلی میں شامل کر دیا ہو۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ بعض ان نظموں کو جو مولانا کے جذباتِ قلبی کی ترجمان اور فنِ شعر کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں ان کو کہیں جگہ نہ دی اردو نظموں میں وہ دو قطعے (جو اسی باب میں مذکور ہیں) باوجود خطوطِ شبلی میں شائع ہو جانے کے کلیاتِ اردو سے خارج کیے گئے یہی عمل ایک فارسی قطعہ کی نسبت کیا گیا جو عطیہ بیگم کو بطور خط لکھا تھا۔ اسی طرح ایک خیر مقدم کی نظم ہے جس کے دو شعر مولانا کے خطِ مکتوبِ موسومہ مہدی حسن میں درج ہیں نظر انداز کر دی گئی۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا اور کچھ نہ کچھ تاویل کر لیجیے، مگر حیرت ہے کہ قابلِ شاگرد "مصنفِ حیاتِ شبلی" نے دستہٴ گل کی ایک نظم میں تخریف کا بھی کمال دکھلادیا مولانا نے پہلی کے پُرکیف قیام میں ایک قطعہٴ عطیہ بیگم کو لکھ کر بھیجا تھا (خطوطِ شبلی ۱۷۱ میں درج ہے) لیکن فرزندِ روحانی نے اس کو غزل بنا کر دستہٴ گل میں پیش کیا حالانکہ وہ

غزل کی تعریف میں بھی نہیں آتا اور کئی جگہ تحریف بھی کر دی ہے پورا قطعہ حسب ذیل ہے اور جہاں جہاں تعریف ہو وہ اسی کے تحت میں لکھ دی گئی ہے۔

- (۱) نسیم صبح بیا وہ مردی بیشش آ پیام بندہ بہ آں خاکِ آسماں پُرساں
(کس قدر بھدی تحریف ہے حالانکہ محض شاعر ہی ہیں)
- (۲) متاع جاں دہم از پاسے فردی خواہی و گرنہ لطف بہ فرما و رایجہاں بہ رساں
- (۳) و فریاد شوق مشکبانی تواند شد و دوا دار دنگ و ہمیں نہاں بہ صلا
- (۴) حدیث شوق نہ چنداں کہ در بیان گنجد اگر نہ جملہ تو اں اچھی تو اں پُرساں
- (۵) توستے مکن از پیش خود در و چیزے پناں کہ با تو بگویم تو، پھنساں پُرساں
- (۶) بہ آستانہ او سر نہ وزدوئے ادب در و دو گوئی و دعا یم نہاں ناں پُرساں
- (۷) بگو زمین تو بہ اعظم گدہ آمدن گفتی بیا و مرتبہ من بہ آسماں پُرساں
- تحریف بگو کہ بر طبق وعدہ رائے پڑی (و وعدہ رائے پڑی بھرتی نہیں تو کیا ہو)
- (۸) سلام شوق و دعا کے بجائے دولت جاہ بہ نازلی و بہ زہرا یگیاں یگیاں پُرساں
- تحریف سلام شوق و تمنا ز بندہ نعمانی بہ ساکنان در او یگیاں یگیاں پُرساں
- (ز بندہ نعمانی کی تحریف و ترکیب کی داد دی جائے اور محبوب کا دروازہ ہو یا گویا کو چہ ہو)
- مقطع کی تحریف میں تخلص تک بھی بدل دیا گیا، حالانکہ دستہ شکل کی اور دوسری نظموں میں شبلی پھر تخلص ہی بجز ایک غزل کے جو اس محرفہ نظم کے بعد درج ہو اور کہیں ”نعمانی“ کا وجود نہیں اور یہ جو بھی اس لیے معرض وجود میں لایا گیا کہ پہلی تحریف و تبدیلی پر ذہن رجوع نہ ہو۔

حیاتِ شبلی میں ایک باب سیاسیات بھی (۵۸۵ تا ۶۳۶) ہو، لیکن اُس پر تبصرہ سے قبل مولانا شبلی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا مناسب ہے نہ ہو گا۔ اُس بات سے تعجب اور افسوس و درنہ ہوتا ہو کہ کچھ تعلیم جس کا اثر ہوا خاکِ آب بھی ہندستان میں موجود ہو پولیٹیکل آواز سے بالکل خالی تھی نصابِ تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی، تاثر محسوس کتابیں اگر پڑھائی جاتیں تو تاثر بھی حدِ سب سے نہیں بلکہ فنِ انشا کے اعتبار سے، طالبِ علموں کی سادہ اور غسانہ طرزِ زندگی جو بیوی خرافاتوں سے مبرا اور بے غرض شوق، کمالاتِ علمی کے لیے جس قدر مفید تھا اسی زمانوں کو معاملاتِ ملکی سے الگ رستا تھا، ہم کو تو جرات نہیں ہو سکتی مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں تو بیانِ سبب میں ہم سے مختلف ہیں

ان الہ لما من بین البشر البعد الا عم عن السياسة

(مقالاتِ شبلی جلد سوم صفحہ ۸۹)

مولانا خود اسی تعلیم سے مستفید ہوئے تھے البتہ جب علی گڑھ کالج میں آئے تو چون کہ یہاں سیاسی ماحول بھی تھا مکن ہو ان کو سیاست بھی بچہ قرب ہوا ہو لیکن ان کی زندگی میں سلاسلہء ہمک یعنی جب کہ وہ عمر کی چون منزلیں طو کر چکے تھے سیاسیات کی کوئی شعاع پردے کے اندر سے بھی چمن کر نظر نہیں آتی، کالج سے رخصت ہو کر وہ ایک ریاست میں ملازم رہے جہاں سیاسی آفتاب طلوع ہی نہیں ہوتا پھر مزدورۃٴ اعسلا میں شامل ہوئے جس کے قواعد اساسی میں صاف صاف سیاست سے بے تعلق رہنے کا اعلان تھا۔

مصنفِ حیاتِ شبلی نے اس باب میں ادیبانہ ہمتیہ کے ساتھ بتایا ہو کہ ہندوستانی سیاست میں ان کے سامنے پیش کی گئی کہ "یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہو لیکن

اسلامی سیاست میں وہ پورے بین الاقوامی تھے، اس کے بعد مابین الاسلامی سیاست میں ترکوں سے محبت کا عنوان دے کر ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس میں چندہ : ترکی کے سفر اور سفر نامہ کی ترتیب وغیرہ کی تکرار بیان کے بعد ایک نئی بات لکھی ہر کر ۱۸۹۶-۹۵ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلے میں یورپ کا

ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بانی کر کے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا اور ہندوستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں تو مولانا سے ضبط نہ ہو سکا انہوں نے ۲۱ فروری ۱۸۹۷ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڑھ کالج کی ملازمت میں تھے۔ (۵۸۷)

مصنف نے نہ صرف لائبریری مبالغہ کیا ہی بلکہ علی گڑھ پر بھی ایک حملہ کر دیا ہو، مگر اس زمانے کے اخبارات دیکھے جائیں تو یہ شہادت ملتی ہو کہ انگلستان میں ہی مفروضہ منظم آرمینیا کے پرو پانڈا کا جواب وہاں کے اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا جس میں بعض اعلیٰ مرتبہ کے انگریز بھی ہم آہنگ ہوتے تھے مثلاً مئی ۱۸۹۷ء میں مسلمانان لندن نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا تو اس میں برطانوی بڑے کے ایک ایڈمرل اور ایک معزز ممبر پارلیمنٹ نے نہایت زبردست تقریریں کیں جو ان کے تجربات اور ذاتی معلومات پر مبنی تھیں ایڈمرل کی تقریر تو نہایت معرکہ کی اور ایک مشہور مخالفت ترک کے پرو پیگنڈے پر ضرب کاری تھی یہ دونوں تقریریں مداس کے انگریزی اخبار ”محمدن“ میں شائع ہوئیں جو لندن کے اخبارات سے منقول تھیں اور سرسید یاکا لچ ہی کے اخبار میں مع ترجمہ اردو چھاپی گئیں، جولائی ۱۸۹۷ء کے تہذیب الاخلاق میں بھی مذکور سلطانی کا عربی متن اور اردو ترجمہ (وحدالین سلیم کا کیا ہوا) شائع ہوا۔ یہی زمانہ تھا کہ لارپول کے نو مسلم مسٹر عبد اللہ کو بیکلم

نے اپنے اخبار کر سینٹ میں سوڈان کے متعلق مسلمانان عالم کے نام ایک پیام شائع کیا تھا کہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد نہ دی جائے اس کا ترجمہ بھی اخبارات میں شائع ہوا غرض تمام مسلمان اخبارات ایسے ہی مضامین سے بھرے ہوتے تھے اسی زمانے میں ایک مستقل کتاب "THE SO-CALLED ARMENIAN ATROCITIES" انگلستان میں شائع ہوئی جس کا ترجمہ "مفروضہ ظالم آرمینیا" کے نام سے اردو میں چھاپا گیا، یہ تو اس زمانے کی حالت تھی اب مولانا کے مضمون کی حقیقت دیکھیے جس میں حقیقت کا پردہ چاک کیا گیا ہو، یہ مضمون بیروت کے اخبار غرات الفنون کے ایک آرٹیکل کا پورا ترجمہ بھی نہیں بلکہ تلخیص ہے اور اس اصل مضمون کا ماخذ بھی ایک فرانسیسی اخبار ہے۔ مولانا کا یہ ٹھٹھس مقالات شبلی کے چار صفحات میں آیا ہو اور اسی میں انھوں نے ظاہر بھی کر دیا ہو کہ یہ تلخیص ہے۔

ایک دوسرا زرخ بھی اس جوش و اضطراب کا ملاحظہ ہو: ندوۃ العلماء کے جلسے ۱۳۱۲ء کی روداد جو مولانا نے لکھی ہے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہے جلسہ ختم ہونے کے وقت یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ندوۃ العلماء کے جلسے اور اس کی تمام کارروائیاں ختم ہو گئیں اور اگر کل کوئی کارروائی یہاں ہوگی تو اس کہ ندوہ سے کچھ تعلق نہ ہوگا اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ دوسرے دن بعض آدمیوں نے شاہ مینا میں ایک مجمع کرنا چاہا تھا (اور کیا بھی) جس میں وہ مسئلہ آرمینیا اور قوانین حجاج کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

اسے مصنف حیات شبلی کی یہ جہارت بھی قابلِ داد ہے کہ بعض ایسے مضامین جو دوسروں نے لکھو اور مولانا نے ان کے ترجمے یا تلخیص کو چند تعارضی سطور کے ساتھ اندوہ میں شائع کیا وہ بھی مولانا کے مقالاتِ مذہبی میں شامل کر لیے گئے، (۱۱) الاسلام صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۷ میں مولانا کے صرف دو صفحہ پر اور پورا مضمون عربی کتاب کا ترجمہ ہے یہ عربی کتاب خود بھی فرانسیسی زبان سے ترجمہ ہے، (۱۲) قرآن مجید میں خدا نے نہیں کیوں کہا میں ۲۸ تا ۴۴ مولوی حمید الدین کے مضمون کی تلخیص مولانا نے تعارضی سطور پر ترجمہ و تلخیص کو ظاہر بھی کر دیا ہے۔

ہم کو افسوس ہے کہ باوجود اس کے ایڈووکیٹ، لکھنؤ کے اخبار نے اس امر میں غلطی کی اور شاہ مینا کے جلسے کا ذکر ایسے پیرائے میں کیا جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ جلسہ مذکورہ علما سے تعلق رکھتا تھا، سوال ہو سکتا ہے کہ اس وقت مولانا کا وہ اضطراب اور وہ جوش کہاں تھا اور کیوں وہ اس جلسے میں شریک نہ ہوئے اور ونداد میں اس سے برأت کی کیا وجہ تھی۔

اس کے بعد طرابلس کی لڑائی کا تذکرہ ہے جو آخر ستمبر ۱۹۱۷ء میں شروع ہوئی لیکن یہ تذکرہ طرابلس کی خود مختاری شیخ مسخوسی اور الوزبے کے اعلانات کے ذکر اور اس واقعے کی خوشی میں مولانا کا چند طلباء کو بلا کر مٹھائی کھلانے کے ذکر تک محدود ہو کر گویا ایسا نشان درد و جوش نظر نہیں آتا جس سے طرابلسی عربوں کے مصائب کا اتنا اثر معلوم ہو، البتہ اپریل ۱۹۱۷ء کے اجلاسِ ندوہ میں جس کی صدارت علامہ رشید رضا نے کی اور جس کا انعقاد مولانا کے مغائری میں ہو چکا دیز پاس ہوئیں ان میں یہ اہم تجاویز دیکھتے ہیں (۱) ملکِ معظم کی رونی افروزی ہند پر خوشی و مسرت (۲) ہر ہائی سن یکم صاحبہ بھوپال ہرنائی سن نواب رام پور ہرنائی سن آغا خان کو خطابات کی مبارکباد (۳) گورنمنٹ کا شکریہ کہ اس نے اہلی کو جتہ اور مینورج پر کسی قسم کی کارروائی کرنے سے باز رکھا۔ مگر دوسری طرف دیکھیے اسی غلام آباد علی گڑھ میں طرابلسی عربوں کی ہمدردی میں طلباء اور اسٹاٹ اور آئری می سکرٹری کالج نے خاص طور پر چند سے کیے طلبانے ہستے میں جو اچھا کھانا معین تھا اس کو ترک کر دیا اور اس سے بے پس انداز ہو یعنی تقریباً پانچ سو روپے مانا وہ طرابلس فٹ کو دیا اکثر نے تمام آرائشی سامان اور قیمتی لمبوسات فروخت کر کے اُن کی قیمت طرابلس فٹ میں داخل کی اسٹاٹ نے اپنے کلب کا سارا اسی فٹ میں منتقل کر دیا غرض مئی ۱۹۱۷ء تک ۶ ہزار روپے مغلومان طرابلس کی امداد میں بھیجا گیا (تاریخ کالج دانسی ٹیوٹ گزٹ ۱۹۱۷ء)

جنگ بلقان کے متعلق جو اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شروع ہوئی مصنف خیالات کھینچتے ہیں کہ ”اس زمانے میں اس تحریک کی راہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام ہمارے ہیرو کا بھی ہے، شہر آشوب اسلام کے نام سے غم و حسرت بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثے پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا“ (۵۹۱ عیات) یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہی مولانا کی کوئی رہنمائی نہ حرکت اور اقدام نہیں، دیگر متعدد شعرائے بھی جگر گداز نظمیں لکھیں اس تحریک کے اعلیٰ رہنما علی گڑھ کالج کے قدیم اور جدید طلباء تھے اور کالج کا سکریٹری، قدیم طلباء میں جنگ طرابلس کے وقت ہی سے مولانا ظفر علی خاں نے رہنمائی کی اور ایسی کہ مولانا خاں نے اس کے اعتراف میں دو شکر یہ مساعی ظفر علی خاں کے عنوان سے ایک نظم لکھی جنگ بلقان میں مولانا محمد علی منظر پر آئے اور انصاری طبعی مشن کا اہتمام کیا جس میں کالج کے طلباء اور اساتذہ نے ہزاروں روپیہ سے ہی مدد نہیں کی بلکہ متعدد توجروں اپنی تعلیم ملتوی کر کے خدمت کے لیے طبعی مشن میں شریک ہو کر ترکی گئے۔ حقیقت میں صرف علی گڑھ ہی ایسا ادارہ ہے جس کی تاریخ میں ابتدا سے ترکی تعلقات نہایت شان دار

۱۔ چند شہداء (۱) اے صدق و صفائی زندہ تصویر اے شیر دل اے ظفر علی خاں

(۲) بلقان و طرابلس میں ناگاہ اٹھا ستم و جفا کا طوفان

(۳) ہم درد ہی اہل دیں نے آہستہ ہو ہر قرے کر دیئے نمایاں

(۴) پھینچے وہ بہ نیکل سنیل آتش دامن ترے ہو مشر رہے پہاں

(۵) ڈالا یہ تری پکار نے غل جی اٹھے وہ مڑے ہو تھے بے جاں

(۶) جو دل غم قوم سے تھے بے جاں چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں

(۷) ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ سنتا بھی ہے اسے ظفر علی خاں

(۸) نازاں ہو وہ درس گاہ مجھ پر تعلیم پر جس کے تو ہے نازاں

نظر آئیں گے جنگ بلقان کے ختم ہونے پر ترکی مشن اور غلیل خالد اور پھر سسٹہ میں مشہور امیر البحر و منابے نے سرسید کے ہی کالج میں انگریز اعتراضات ہمدردی کیے۔ مصنف نے ترکی ہم دردی کو صرف تین نظموں تک محدود کر کے اسیشن لکھنؤ سے ڈاکٹر انصاری کی روانگی کا یہ سماں دکھلایا ہے :-

”ڈاکٹر صاحب ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہوئے دعاوی سلام کر رہے ہیں کہ دفعتاً اس بہت تن گوش علامہ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا دفعتاً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لیے اور گاڑی اسلامی حمیت و غیرت کے ان گہرے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھ گئی۔“ (۵۹۵ حیات)

بلاشبہ عبارت ادیبانہ ہو لیکن واقعیت سے خالی، اول تو علامہ وقت کو کسی معزلی جبار سے بھی سابقہ نہیں پڑا کہ سر کا جھکنا نہ جھکنا معلوم ہوتا۔ تاہم نہ وہ کیے جملے سنگ بنیادیں خود دلانا لکھتے ہیں کہ ”مقدس علما عیسائی فرماں روا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب کے خم تھے“ ان مقدسین میں مولانا کی ذات گرامی بھی تھی، پھر دربار دہلی کے موقع پر درشن جہود کے کے سامنے شاہ کی بار بخشی میں ایسی ہی تعلیم کا مزا ہر فرمایا، مگر اسیشن لکھنؤ اور ڈاکٹر انصاری کی قدم بوسی یہ تو واقعہ ہی سرے سے غلط معلوم ہوتا ہو مصنف کو زور بیان میں یہ خیال نہیں رہا کہ مولانا کا ایک پانچ مصنوعی تھا اور وہ لکڑی کے ہمارے چلتے تھے اور ان کو ایک کھڑے ہوئے آدمی کے بوٹ تک جھکنے کے لیے پہلے سے ارادہ کرنے اور اہتمام کی ضرورت تھی دفعتاً جھک کر بوسے کو بوسہ دینا ممکن ہی نہ تھا مسلم لیگ میں مولانا کا احترام و وقار تھا لوگ ان سے محبت کرتے تھے اگر دفعتاً جھکے تو

وہ اتفاقاً گر پڑنے کی شکل ہوئی اور تمام مجمع میں اضطراب پھیل جاتا اور مولانا کو سمجھانے کی کوشش ہوتی۔

مولانا کی یہ بین اسلامی سیاست بس ابھی چند نظموں پر ختم ہو جاتی ہو ۱۸۷۷ء کی طرح چندہ جمع کرنے کی ترکی مسکات کی خریداری کی کوشش اور مصنوعات ترکی کی نمائش وغیرہ میں وہ کہیں نظر نہیں کرتے، ان نظموں میں بھی خلافت و خلیفہ کا نہیں بلکہ حکومت اور دولت عثمان کا ماتم ہو۔ حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک (اور) زوال دولت عثمان زوال شرع و ملت ہو۔

اب مصنف نے مسجد کان پور کے ہنگامے کو شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر مولانا کی ان نظموں کو نقل کیا ہو جو اس ہنگامے کے متعلق انھوں نے لکھی تھیں اس ضمن میں لکھتے ہیں :-

کان پور کے محلے چھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ تھی وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی جس میں مسجد کا ایک حصہ بدو و خانہ تھا بیچ میں آگیا اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا حالانکہ اس کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی اس واقعے نے تمام مسلمانوں میں اک آگ سی لگا دی۔ ۱۲ مارچ ۱۸۷۷ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی مسلمانانِ کان پور نے مولانا عبد القادر آزاد بھائی مدرس اعلیٰ مدرسۃ الہیات کان پور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا جلسے کے بعد پُر جوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے مسجد کا رخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چُن چُن کر رکھنے لگے مسٹر بلائر کو پتی کمشنر کان پور نے

سے ڈاکٹر انصاری نے ان کے فروخت کی کوشش کی اور لڑا اب ذکار الملک نے اس میں اعانت کی تھی
سے ڈاکٹر انصاری نے اہتمام اور ذکار الملک نے اقتدار کیا تھا۔
سے جم ۱۱ وچہدہ ”ڈاکٹر الملک“ ہو۔

یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے ان پر نہایت بے رحمی سے دُور سے گولیاں برسائیں اور قریبے قریبے ہر شخص مارے شہیدوں اور زخمیوں میں نہتے بچے بھی شامل تھے، اس خونیں واقعے نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہچان و اضطراب بپا کر دیا، مسلمان ہی اور اُن کے قائد مولانا آزاد بھائی گرفتار کیے گئے اور ان پر مقدمات چلائے گئے عام مسلمانوں نے ان مظلوموں کی امداد کے لیے جذبہ کیا اور قانون پریشہ مسلمانوں نے عدالتی پیروی کے لیے خدمات پیش کیں، اس واقعہ پر مولانا نے متعدد نظمیں لکھ کر اخبارات میں شائع کرائیں، اس ہچان و جوش کے نتیجے میں حکومت صوبہ اور حکومت ہند دونوں کو تردد ہوا اور مصالحت کی سلسلہ جنابانی شرفِ جہمی اس پر بھی مولانا نے ایک نظم لکھی جس کے چند شعر اس سلسلہ بیان میں پڑھنے کے قابل ہیں :

- ۱۔ لوگ کہتے ہیں کہ کام ہیں آمادہ صلح یہ اگر سچ ہو تو جز خوبی نقدیر نہیں
 - ۲۔ لیکن انعام گراں قدو ذلالت کی طبع حقیقت میں صلح کی کوئی تدبیر نہیں
 - ۳۔ مابالبحث اگر ہو تو فقط مسجد ہو دیت قتل شہیدان جوان میر نہیں
 - ۴۔ جز مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
 - ۵۔ آپ کی ہیں وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
 - ۶۔ آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ حاملِ فقہ نہیں واقف اسرار نہیں
- بالآخر مصالحت ہو گئی مگر اکتوبر کو والیس رائے ہند خود کان پور آئے لا ممبر حکومت ہند سر علی امام نے حکومت کی اور مولانا عبد الباقی فرنگی محلی نے مسلمانوں کی نیابت کی اور معاملہ طر ہو گیا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے مقدمے واپس لے لیے جائیں اور مسجد جو بلندی پر تھی اس کے ٹوٹے ہوئے حصے کو اس طرح بنا دیا جائے

کہ ادھر چھت دے کر وضو خانہ پھر قائم کر دیا جائے اور چھت کے نیچے سے سڑک کی آمد و رفت کا راستہ رہے۔

اس فیصہ پر مولانا نے وائسرائے کو خطاب کر کے حسب ذیل قطعہ میں اپنی شکر گزاری کا فرض ادا کیا۔۔۔۔۔ اور مولانا ابوالکلام کو جو اُس زمانے میں مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما اور اس تحریک کی جان تھے لکھا ”براہِ رم کان پور کا معاملہ جس طرح ہوا فیصل ہو گیا اب سر دست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں“ (ملاحظہ ہو حیات ۲۰۰ تا ۲۰۷) غرض ہندستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ متعدد حیثیتوں سے ذکر کے قابل ہے، مولانا اس وقت بمبئی میں تھے ”انھیں اس کا غم تھا کہ وہ بمبئی میں کیوں تھے۔ شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہو“ اس کا کیا جواب ہے کہ مولانا نے ان آوازوں پر مطلق کان نہ دھرا اور بمبئی کے پرفضا اور حسین منظروں میں نالہ مارے موزوں تک ہی اپنی ہم دردیوں کو عاجز رکھا، دراصل یہ واقعہ اور اس مصالحت و شکرِ یے میں بہت سی بصیرتیں اور عجبتیں ہیں۔ پہلے وضو خانے کو جزر مسجد کہا گیا اس پر فقاوے ہوئے غریب اور پر جوش مسلمانوں نے جانیں قربان کیں عورتیں بیوہ ہوئیں بچے یتیم ہوئے اور سپہِ الگ صرف ہوا مگر نتیجہ ہے

از صحن خانہ تابہ لب بام ازان من در سقف خانہ تابہ نریا ازان تو

یعنی یہ قطعہ شکر گزاری کلیات میں موجود ہے آخر کے دو شعر ہیں۔

گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے

تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ شناس ان میں یہ پیش کشِ شبلی نعمانی ہے

یعنی یہ خط ۲۰ اکتوبر کا ہے۔

اگر حقیقت فقہ کا مسئلہ ہی تھا کہ مسجد وضو خانہ کی زمین جزو مسجد نہیں، خواہ اس پر وضو خانہ ہو یا غسل خانہ تو اس قربانی کی ضرورت کیا تھی صرف دالان کی چھت پر قبضہ کو فوج عظیم اور فوج میں سمجھ لیا گیا اور اس زمانے کے معلم اول حامل فقہ (مشبلی) نے مسئلہ فقہ کی صحیح تعبیر سمجھ کر تشکر کیے کا فرض ادا کر دیا اور تحریک کی جان سرد پڑ گئی جزو مندرجہ آج بھی سرکار کی صورت میں ان علمائے دین کے فقہ کی خویش یادگار کے طور پر قائم ہو اور ہر راہ رو کو مسئلہ فقہ کی تعبیر بتا رہا ہے۔

اب مصنف سیاست ہند کا عنوان قائم کر کے ملکی معاملات میں مولانا کی آزادی اور سیاست میں فطری صلاحیت اور سرسید سے سیاسی اختلاف کو (جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے) ایک روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرسید نے لکھنؤ میں کانگریس کے خلاف جو مشہور تقریر کی تھی مولانا نے نام چھپا کر ملی گڑھ گزٹ میں اس کا جواب لکھا تھا، لیکن مولانا نے کہیں اشارہ تک نہیں کیا نہ انسی ٹیوٹ گزٹ میں کوئی ایسا مضمون شائع ہوا۔

اس کے بعد اقرار ہے کہ ”باہیں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسین بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر کانگریس کے مطالبوں پر جزو خوانی اور مسلمانوں کی سیاسی گم راہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس۔ اردو اخباروں میں ”ہندستانی“ لکھنؤ کو جسے لکھنؤ کے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد ورمانکا لے تھے بہت شوق سے پڑھتے تھے اور اس سے اثر لیتے تھے لیکن دسمبر ۱۹۰۶ء میں تقیم بنگال کی تیئین نے وقفہ ہوں کی ٹہر کو توڑ دیا نواب وقار الملک کے مضمون کے بعد جو دوسرا بھادوانہ مضمون اس انقلاب کی بشارت لے کر نکلا وہ مولانا شبلی ہی کا تھا جس کی سرخی ”مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ ہو“ آگے چل کر اخبار ”مسلم گزٹ“ کے اجراء مولوی وحید الدین سلیم کی ادارت اور ان سے قدیم اختلاف درمیان گزٹ

اور اخبار میں مولانا کے مضامین لکھنے اور پھر مولوی سلیم سے اختلاف اور مسلم گزٹ میں مولانا کے خلاف مضامین کی اشاعت اور مسلمانوں کی پولیٹیکل کرپٹ کے چار نمبروں کی اشاعت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ”حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون اس قدر مدلل اور پرپوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا“ اس کے بعد مضمون کے اقتباسات درج ہیں اور ان کے بعد ادا ہوا کہ ”بہر حال اس کوئی شبہ نہیں کہ لیگ میں اس وقت جو کچھ انقلاب پیدا ہوا اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ مولانا کے نشر ریز قلم کا بھی کچھ کم حصہ نہیں“ اس کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد ۱۹۱۵ء کو مولانا کی ایک تنظیم پیشین گوئی تیار ہو۔ مسٹف کو خود اقرار ہے کہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی تھی اور اس کے

بعد بھی مجلس سے نکل کر صرف میدان صحافت تک اوروہ بھی چند روزہ ان کے قلم کی ٹنگ و دو ٹنگ محدود رہی، اگر مسلم لیگ کی تاریخ پر سنہ ۱۹۰۴ء تا سنہ ۱۹۱۲ء نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس نے سیاسیات ہند میں بتدریج قدم بڑھایا اور سنہ ۱۹۱۰ء میں ہی وہ ایسی پوزیشن میں آگئی کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل ہو چکا ہے اس سال کے صدر کانگریس سر ولیم ڈیلبرن اور ہنر ہائیٹس آغا خان کے تبادلہ خیالات کے نتیجے میں ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز ہو چکی تھی

۱۔ مولانا شاہی کا یہ مضمون ان کے مقالات میں شائع ہوا ہے جہاں تک ادبیات معنی طرازی کا تعلق ہو خراب ہے لیکن حقائق اور نفس سیاست کے اعتبار سے بہت کچھ محل نظر و انتقاد ہے۔ سر سید پر جو اعتراضات ہیں وہ غیروں کے دسترخوان کی ریزہ چینی ہے، اب ابد عذر مسلمانوں کی سیاسی تاریخ پر سے پردہ اٹھ چکا ہے متعدد مستند تاریخین شائع ہو چکی ہیں ان کو پڑھنے سے سر سید کی دُور بینی اور ان کے جانشینوں کی کانگریس میں بدعظم نہ ہونے کی جدوجہد کی عظمت معلوم ہوتی ہے، اس معلومات کے لیے سیاست ملیہ (اردو) اور مسلم اندیا (انگریزی) قابلِ مطالعہ ہیں۔

اور اجلاس سالانہ مسلم لیگ منعقدہ ناگ پور کے ختم ہوتے ہی علم سیاسین ہندوستان اور وقار الملک (بانی مسلم لیگ) کی قیادت میں اپیشل ٹرین کے ذریعے الہ آباد آئے جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا چالیس مسلم اور ساٹھ ہندو سیاسین نے بحث و مباحثہ کے بعد متنازعہ امور پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی، لیکن اس کمیٹی کے نتیجے سے پہلے ہی طرابلس و بلقان کے واقعات جو دل زخمی ہو رہے تھے ان پر تین بیگنل نے اور سخت چرکے دیے، ہندوؤں نے اس تقسیم کی تیغ پر انتہائی خوشی منائی اور صدر کانگریس (۱۹۱۷ء) نے حکومت کے سامنے وہ گہرائے عقیدت پیش کیے کہ سرسید کے تو خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے اور صاف لفظوں میں برطانوی راج کو خدا کی نعمت قرار دیا، اسی طرح ایک اور ممتاز لیڈر نے کہا کہ ”ہر شخص کا دل برطانوی تاج کی وفاداری اور عزت کی خوشی میں رقص کر رہا ہو۔“ بہر حال وہ کمیٹی بلا نتیجہ رہی۔

اب اس تین بیگن تقسیم یہ جب کہ یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں ملالوں کے مسلم لیڈر وقار الملک ایک انقلاب آفرین مضمون شائع کیا جس میں رُوح انقلاب یہ فقرہ تھا کہ ”یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہو کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمان کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے لامحالہ مشورہ ہر اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہو۔“ یہ مضمون سماج و فرائی طول و عرض میں شائع ہوا اور ایگلز انڈین اور کانگریس پریس میں بحثیں شروع ہوئیں۔ اور کامریڈ (انگریزی اخبار) جو مولانا محمد علی شائع کرتے تھے (نے معترضین کو دندان شکن جوابات دیے، مولانا شبلی نے تو تقریباً ویسے ماہ بعد میدان صاف لے کر کانگریس پریس نے گورنمنٹ کو دھکی سے قہر کیا۔

دیکھ کر وہ مضمون لکھا تھا جس کی اشاعت مسلم گزٹ اور دو چار مسلم اخبارات تک محدود رہی۔ مضمون کی نسبت خواہ کتنی ہی تعریف کی جائے مگر یہ حقیقت اٹل ہو کہ مولانا سیاسی اعتبار سے قوم میں متعارف تک نہ تھے نہ وہ کبھی کسی سیاسی انجمن میں رکن خاص یا عام ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اس لیے صرف ایک مضمون سے شملہ کی طرف سے قبلہ کی طرف منہ پھیر دینا معجزہ ہی نہ کہنا اور منہ پھیرنے والے وہی لوگ تھے جو سیاست میں پیرے ہوئے تھے، مولانا کو مصنف حیاتِ شبلی میں خواہ کتنا ہی ”رستم و شتاں“ بنائیں مگر تاریخِ سیاست میں تو وہ ”یلے درسیٹاں“ بھی نہیں، ایک ربع صدی گزرنے پر جب کہ اقوام و ممالک کی سیاست کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے سرسید کی سیاست پر جو ایک موقتہ اور مرقعہ ضیاء وقت پر مبنی تھی اعتراضات کرنا سعیِ لاحاصل اور کوششِ بے نتیجہ تھی، تاہم سیاست میں بھی کچھ خیر تغیر پر اصول ہوتے ہیں اور ان ہی پر اقوام و ممالک کا انحصار زندگی ہوتا ہے سرسید کی سیاست میں یہ اصول کہ مسلمان ہندستان میں ایک جدا گانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے مخصوص مفادات ہیں جیسا کہ ۱۸۸۵ء میں اپنی جگہ صحیح تھا ویسا ہی آج بھی صحیح ہے اور بعدہ کانگریس کے ساتھ اتحاد و افتراق نے اس کی اور زیادہ صداقت منوادی ہے، حکومت کے ساتھ وفاداری کی تلقین نہ صرف اس زمانے میں سرسید نے کی بلکہ اس زمانے میں بھی جب کہ اس تلقین پر اعتراضات کی بوچھاڑ تھی۔ ہندستان کی سب سے بڑی آزاد اور مولانا کی مدوٰج انجمن نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھی یہی تلقین کی جا رہی تھی۔

اس سے آگے تیز روزِ جماعتِ احرار کا تذکرہ کر کے مصنف لکھتے ہیں کہ نہ حریت خیال کے مسافر نے یہاں تک منزل طوی کی تھی کہ بہت کچھ کہند سال

وفادارانِ قوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے نوجوانوں کی خیرہ سری ہمارے
 ازلی آقاؤں کو ہم سے سرگرداں نہ کر دے اور طرابلس، لبنان، بکمان پور
 اور یونیورسٹی کے معاملات میں ہماری آزادہ گوئی اور مسلم لیگ کے انقلاب
 مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد اور کھنڈ پیکٹ وغیرہ میں ہماری سیاسی
 آزادہ ردی سے حکومت وقت کے دل میں ہماری طرف سے غلط فہمی
 نہ ہو اس لیے بظاہر صلح کان پور کے شکرے میں اور درحقیقت مسلمانوں
 کی وفاداری کا یقین دلانے کی خاطر ہمارا راجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی
 میں ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا جس میں حزب الاسرار کے بھی بعض نام و
 اصحاب نے افسوس ہو کہ شرکت کی اور گویا انھوں نے اس طرح اپنے پچھلے گناہوں
 کا کفارہ ادا کیا اس وفد نے ۵ اپریل ۱۹۱۷ء کو دائرے سے ملاقات
 کی اور ایک ایڈریس پیش کیا لیکن مولانا ابوالکلام اور بعض دوسرے
 افراد نے اس وفد سے قطعاً احتراز کیا اور اس کے خلاف سخت مضامین
 لکھے ” (۶۲۹)

اس کے بعد مولانا کی چند اسی قسم کی نظمیں درج کی ہیں۔ افسوس یہ ہو کہ منصف
 حیات بشلی نے اس زمانے کی سیاسی حالت کو کچھ بھی نہیں سمجھا اور یہاں تک غلطی
 کی سلسلہ کے ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں کھنڈ پیکٹ کا بھی ذکر کر دیا جو ۱۹۱۷ء میں
 ہوا تھا، اہم وقت صورت حال یہ تھی کہ انگریزی اخبارات مسلمانوں کے سیاسی
 رویے کے متعلق بہت ہی مخالفانہ مضامین لکھ رہے تھے اور انگلستان کے بعض
 اخبارات (لندن ٹائمز اور شینل ریویو) بہت زیادہ ذہر اُگل رہے تھے اور
 مسلمانوں کی نسبت گورنمنٹ سے ناراضی اور باغیانہ خیالات کی اشاعت کی
 جا رہی تھی۔ تب ۱۹۱۷ء میں دائرے نے اپریل ۱۹۱۷ء کو نسل کے اجلاس میں جو تقریر

کی تھی اس میں ترکی اور برطانیہ کے تعلقات اور ایمان کی حالت کے متعلق بھی ایک بیان تھا جس کے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ "اب میں مسلمانان ہند سے ایک کلمہ دوستانہ انتباہ و نصیحت کا کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک عظیم سلطنت کا جزو ہیں لہذا ان کو اسلام کے ایک جم واحد ہونے کے دعوے کا کوئی ناواجب مفہوم نہیں قرار دینا چاہیے میں نہایت دوستانہ پیرائے میں ان کے یہ ذہن نشین کروں گا کہ ان کو اپنے اندر مناسب قوت فیصلہ ضبط نفس اور وسعت نظر ان مسائل کی نسبت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے جو مجموعی طور پر سلطنت کی بیرونی پالیسی پر موثر ہوتے ہیں۔"

اسی زمانے میں یورپ کا مطلع امن تاریک ہو رہا اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے خلاف پرو پگنڈا بھی پُر زور ہوتا جاتا تھا اس لیے ہر نقطہ خیال کے لیڈروں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ ایک مستند طریقہ سے ان تشویش و شبہات کو دور کیا جائے اور اپنے وفادارانہ رویے کا یقین دلایا جائے چنانچہ اپریل میں نہیں بلکہ مارچ میں ایک معتد رڈ پوٹیشن وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک ایڈریس پیش کیا جس میں موجودہ سیاسی تحریک کی تاریخ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش اور حیرت انگیز تواتر کے ساتھ جو واقعات کہ اس دو تین سال میں پیش آئے تھے ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"حضور والا یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ اس ملک کے مسلمانوں پر ان کا گہر اور درد انگیز اثر نہیں ہوگا، تمام مشاہدہ کرنے والوں پر یہ بات روشن ہوگی کہ ایسے اذوس ناک واقعات کے اجتماع کی مثال گزشتہ زمانے

میں بالکل نہیں مل سکتی خود حضورِ حق کی ہم دردی ہمارے کثرتِ مسلک میں ہمارے ساتھ تھی ہمارے اس تاریک زمانے کے احساسات کی تیزی اور حدت سے بخوبی واقف ہیں لیکن کوئی آدمی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتا جو اس طرف دُور کا اشارہ بھی کرتی ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس غیر معمولی دشواری کے موقع پر اپنی قوت تمیزی اور ضبط کو ہاتھ سے جانے دیا ہو یا تختِ برطانیہ یا ہر جمعی کی ہندوستانی قانونی حکومت کے ساتھ اپنی محکم اور مضبوط روایتی وفاداری سے ایک سرو بھی تجاؤز کیا ہو ہم نے نہایت تکلیف اور معاندانہ نگاہوں سے ان قابلِ افسوس کوششوں کو دیکھا ہو کہ جو باوجود ان مسلمہ واقعات کے حال میں بعض حلقوں میں ہماری قوم کو بدنام کرنے اور گورنمنٹ کے ساتھ جو ہمارے تعلقات ہیں اُن کے غلط معنی پہنانے اور حضورِ ملکِ معظم کی تمام مسلمان رعایا کی نیتوں اور چال چلن کو دھبہ لگانے کے لیے اس غرض سے کی گئی ہیں تاکہ گورنمنٹ اور برطانوی رعایا کی نگاہوں میں تحقیر کی جائے۔ یہ بات کھلم کھلا بیان کی گئی ہو کہ مسلمانوں کے لیڈر مذہبی جذبات کو مشتعل کرتے ہیں، قومی منافرت کو بڑھاتے ہیں اور برطانوی حکومت کی بدگویی کرنے اور عیسائی مذہب کو بدنام کرنے کا کوئی موقع اُٹھا نہیں رکھتے اور ایک نئی جماعت یہ خیال کرنے لگی ہو کہ اگر بریتانوی ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ یہ بیان بھی کیا گیا ہو کہ اس نئی مسلم تحریک کا ایک شرعاً انگیز پہلو یہ ہو کہ علی گڑھ کے گریجویٹ پیش پیش ہیں اور حکومتِ برطانیہ کی مخالفت علانیہ پھیلا رہے ہیں اور مسلمان اخراج کی وفاداری کو کم زور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

”حضرت والا! بڑے بڑے عام جوش کے موقعوں پر مثلاً امتحان میں پورے اُترنے کے بعد ایسے وقت میں جب کہ ہم ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو رہے تھے اور اس ہم دردی اور خلوص کے محتاج تھے جس کے ہم مستحق تھے ہم کو ایسے بے رحمانہ حلوں کی ہرگز امید نہ تھی، حضور ملک نظم کی، کر وڑ و خادار مسلمان رعایا کی نیک نامی پر جس بدینتی کے ساتھ حملے کیے گئے اگر ہم اس کی تردید میں کوئی تیز فقرہ استعمال کرنے پر مجبور ہوں تو ہم کو اعتماد ہو کہ حضور ہم کو معذور تصور فرمائیں گے ہم اپنی قوم کی طرف سے بلا تامل ان الزامات کو عظیم اور بے بنیاد قرار دیتے ہیں جو سلطنت کی بہترین اغراض کے لیے سخت مُضر ہیں معمولی صورتوں میں قوموں یا افراد پر غیر ذمہ دارانہ حملوں کے ساتھ، حقارت آمیز خاموشی کا برتاؤ ہو سکتا ہے، لیکن جن لوگوں نے ہماری قوم کو بدنام کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے وہ وسیع ذرائع رکھنے والے اور اپنی بات پر اڑنے والے لوگ ہیں اور ان کی شرانگیزی کو ششوں کو اس کثیر اشاعت سے اور بھی زیادہ مدد پہنچی ہے جو ان کے الزامات کو انگلستان اور ہندستان میں حاصل ہوئی ہے ہم لوگوں نے اس لیے یہ خیال کیا کہ جب تک ہم کو ایک کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے جیسا کہ یہ ہے اس وقت تک کسی قوم کے لیے جس کے حالات ہمارے جیسے ہوں یہ بات ناممکن ہے کہ اس قسم کے الزامات کی تردید یا اثر مستند اور کافی طریقے پر کر سکے..... ہم اس موقع پر پورے زور کے ساتھ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندستان کے مسلمان اپنے اس اصول کو آج بھی اتنا عزیز رکھتے ہیں جتنا کہ گزشتہ زمانے میں رکھتے تھے۔“

ہم کو یقین ہو کہ حضور ہمارے اس یقین دہانے کو تسلیم کریں گے کہ ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے کہ رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان پورا اعتماد اور ہندستان کی مختلف جماعتوں میں باہم گہرے دوستانہ تعلقات ہونے چاہئیں لیکن ہم کو اس بات سے سخت رنج معلوم ہوتا ہے کہ ان کوششوں کو جو ہندستان کی دو بڑی ہم سایہ قوموں کے تعلقات کو زیادہ دوستانہ اور ہم دار بنانے کے لیے کی جا رہی ہیں بعض حلقوں میں بُرے معنے پہنائے جا رہے ہیں۔“

مقتضیاتِ وقت کے لحاظ سے اس ایڈرس میں کوئی بات ایسی نہیں جس پر خوردہ گیری کی جاسکے مگر مصنف حیاتِ شبلی کو تو اعتراض ہی سے غرض ہو ایسے نہیں بلکہ ان سے بہت کم خطرناک حالات میں ارکانِ ندوہ نے بھی تو ایسے ہی ایڈریس پیش کیے تھے۔

اب ہم مولانا کو عملی و میدانی سیاست میں دیکھتے ہیں، ان کا سب سے پہلا مضمون بینِ اسلامی سیاست میں ”خلافت“ ہے اس کی نسبت مصنف حیاتِ شبلی نے لکھا ہے کہ (۱) آؤ دیکھتی آمد نہ تھی (۲) لکھو یا لکھا نہیں گیا۔“ سیاست میں اور خصوصاً جب مذہب کی بھی آمیزش ہو اس طرح ضمیر فروشی وہ ہی شخص کر سکتا ہے جس میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہو حالانکہ سیاست کی بنیاد صرف اخلاقی جرأت کے سطح پر قائم ہوتی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں دوسرا مضمون ہے ”مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے“ جس کی نسبت خود مصنف کا ریمارک ہے کہ یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اُس چھ ہزار سالانہ کی قیمت ادا کی جو اُس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی۔ یہ ضمیر فروشی کی بدترین مثال ہے کہ

احکام شرعی میں قیمت ادا کرنے کے لیے کوئی تدلیس کی جائے۔

مولانا نے ہنگامہ کان پور وغیرہ کے متعلق جو تند و تیز اور پُر جوش و انقلابی

نظمیں لکھیں اُن کی داستانِ عبرت بھی حیاتِ شبلی کے ہی اوراق میں یہ ہو کہ

”جنوری سلاٹ ۶ میں کوئی سرکاری پارٹی تھی جس میں مولانا بھی شریک تھے

اس میں لٹنٹ گورنر صاحب سے جب سامنا ہوا تو انھوں نے شکایت آمیز

بلکہ کچھ طعن آمیز فقرے کہے چیف سکرٹری بھی سرگرم رہے اور دوستانہ

شکایت کی، مولانا نے کہا کہ یہ اتفاقی حالات ہیں ورنہ میں نے تو ہمیشہ قوموں

میں بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہو..... اس واقعے کی مزید تفصیل

مولوی عبدالماجد صاحب دریا باہوی کے ایک بیان سے معلوم ہوتی ہو

جو انھوں نے مکاتیبِ شبلی میں مولانا کے ایک رقعہ کی تشریح میں حاشیہ

کے طور پر لکھا ہو، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حاذق الملک حکیم اجل خاں

مرحوم جو ان دنوں نہایت حکام رس تھے اور ریاستِ لداخ سے تعلقات

کی بنا پر مسٹر برن سے اُن کے خاص مراسم تھے لکھنؤ آئے تو یکم فروری

سلاٹ ۶ کو مولانا کو ساٹھ لے کر مسٹر برن سے ملنے گئے مگر مولانا کی

طرف سے اُن کی پیشانی پر بل بہ دستور رہے وہاں سے آکر رات ہی کو

مولانا نے ایک قہقہہ لکھ کر مولوی عبدالماجد صاحب کو بلوایا جو ان دنوں

سیرت کے انگریزی تراجم کے سلسلے میں مولانا کے انگریزی کاروبار کو

انجام دیا کرتے تھے، مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ یہ تحریر بالاسلوب کو

ملی میں اسی وقت لکھا گیا مولانا بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے

ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہو خصوصاً معاملہ کان پور

کے متعلق میری نظموں سے، حاذق الملک حکیم اجل خاں مجھے آج مسٹر

برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے وہ بہت کبیدہ تھے مالان کر اس سے پیش تر بہت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے تم ان کے نام ایک مفصل چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدت العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق و مغرب کے درمیان یکسانیت بڑھے اور ایک دوسرے کی نظر سے جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں دور ہوں چنانچہ اس پر میری تصانیف شاہد ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ مسئلہ میں میں نے اندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہو اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا ایک رزلویشن بھی پاس کرایا۔ پھر معاملہ عبدالکرم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیمہ کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں رہا واقعہ کانپور کے متعلق لفظیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں جس میں سارے ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا " (۶۳۳)

اس معذرت کی تاویل بھی جو مصنف نے کی ہو ملاحظہ ہو: "ہم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ خط بھیجا گیا یا نہیں اور اگر بھیجا گیا تو اس کا کیا اثر ہوا لیکن یہ معلوم ہو کہ مولانا کی اس ساری مداخلت کو کوشش کی غرض یہ تھی کہ ندوہ سے گورنمنٹ کے تعلقات جو اس کے دکاوش اور جدوجہد کے بعد درست ہوئے تھے وہ ان کی بدولت پھر نہ بگڑ جائیں " (۶۳۴)

مگر مصنف یہ بھول گئے کہ مولانا تو جولائی ۱۹۱۷ء میں مستعفی ہو چکے تھے

اور اُن سے طلبا کو درس بخاری تک ممنوع کر دیا گیا تھا اور جس تاریخ تک فروری
 سلاسلہ کو یہ مسودہ تحریر ہوا ارکانِ ندوہ کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی شروع ہو چکی
 تھی ایسی صورت میں ندوہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور نہ ان نظموں سے ندوہ
 کا کوئی تعلق تھا، اس قسم کی عاجزانہ معذرت اور ایک ایسے مضمون کو جو بقول
 مصنف، موقع کی مناسبت سے جہاد کے فضائل و مناقب پر تھا باغیانہ قرار دینا
 جز دلانہ خوف و دہشت کے سوا اور کسی بات پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد بھی لکھتے ہیں کہ ”اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا کی ”سیاسی
 غوئے بد“ میں بقول سعدیؒ اب بھی کوئی تغیر نہیں ہوا چنانچہ اس کے بعد
 ہی اگست سلاسلہ میں جب بڑی لڑائی چھڑی تو گو وہ اس وقت اپنے بھائی
 کی ناگہانی وفات کے سبب نہایت ندھال تھے تاہم اس ناتوانی میں بھی ان
 کی کمان سے یہ تیز کل ہی گیا جس میں انھوں نے غالب کے اس شعر کی سہ
 اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 قضین کی تھی..... یہ تیر پورے نفا نے پڑھا مولوی اقبال احمد صاحب کی ڈیوٹ
 ہو کہ اس نظم پر حکومت نے اُن کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن مولانا خود عرض الموت
 میں گرفتار تھے اتفاق سے ایک نیک دل مسلمان پولس افسر اس زمانے میں یہاں
 متعین تھے جو مولانا کے پورے قدر شناس تھے وہ ان کی اس بیماری کے عذر پر
 اس کو مالتے رہے یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قیدِ عنصری سے آزاد
 ہو گیا (۶۳۵)

لیکن اگست میں جب بڑی لڑائی چھڑی تو مولانا اچھے خاصے تھے دارالمصنفین
 کا انتظام کر رہے تھے کلیاتِ شبلی میں خود مصنف نے اس نظم کو اگست میں لکھا جانا
 بیان کیا ہو اور یوم انتقال سے دس بارہ دن پہلے غلظت گڑھ سے اپنے وطنِ قصبہ

بندول عید الضحیٰ (ادائل نومبر) کے موقع پر گئے، البتہ عید کے دوسرے دن ایسے
 اگر بیمار ہوئے، نومبر سے شدت مرض ہوئی اور ۸ نومبر کو رحلت کی (مخلص
 ۷۲۱-۷۲۲ء حیات) یہ تیر جو نشانے پر بیٹھا کہاں چھوڑا گیا یعنی نظم کسی اخبار یا
 رسالے میں شائع ہوئی یا علیحدہ چھپو اگر تقسیم کرائی گئی یا کسی جلسے میں مولانا نے
 سنائی، اور جب تک ان تینوں میں کوئی بات نہ ہو حکومت کو ایسے احکام کا
 موقع نہیں ملتا، طبع و اشاعت کی صورت میں مالک پریس اور پبلشر سے پہلی
 باز پرس ہوتی ہو اور اسی کی دار و گیر کی جاتی ہو لیکن یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں
 نہ کسی جلسے کے انعقاد کا حوالہ ہو۔ پولس افسر کے علاوہ ایسی گرفتاریوں کا تعلق دیگر
 مجسٹریٹ سے بھی ہوتا ہو اور ایسے وارنٹوں کی خصوصاً زمانہ جنگ میں فوری تعمیل
 کی جاتی ہو کتنا ہی قدر شناسا افسر ہو بغیر اجازت تین مہینے تک اس کا اٹلنا
 محالات سے ہو، اس تمام تنقید سے یہ روایت ایک گپ سے زیادہ قطع نہیں
 ہو سکتی جو محض مولانا کی سیاسی اہمیت کے لیے تراشی گئی مولانا نے یہ نظم ضرور لکھی
 تھی اور راقم تبصرہ جب ان کی رحلت کے بعد ہی اعظم گڑھ گیا تھا تو ان کے قلم
 کی لکھی ہوئی دیکھی تھی مگر اس پر ان کا نام نہ تھا بلکہ کسی اور کا تخلص لکھا ہوا تھا۔

مولانا کے اخلاق و عادات | کا تذکرہ ۱۰۸ صفحات (۷۲۶ تا ۸۳۴)

والیان ملک کے نام بہ نام تعلقات کا بھی بہ اجمال اور تفصیل بیان ہو سرسید کا
 بھی جا بہ جا ضمناً ذکر ہو مگر تنقیص و تنافر کے ساتھ، چنانچہ مولانا کے مذہب کے
 عنوان میں لکھتے ہیں کہ ”خود سرسید کی اس نسکایت پر کہ طلبا نمازیں کیوں شریک
 نہیں ہوتے یہ صاف کہہ دیا کہ چون کہ آپ شریک نہیں ہوتے (سرسید سلسل البول

کی شکایت کے سبب گھر جا کر نماز پڑھتے تھے اور جمع بین الصلوٰتین بھی کرتے تھے“ (۷۱ حیات) حالانکہ مولانا کے مذہب کو اس قہقہے سے دُور کا بھی تعلق نہیں اور اور پھر (صفحہ ۵۰ حیات) میں مولانا کے خط کا یہ فقرہ لکھ چکے ہیں ”مغرب کی بنیاد سبحان اللہ کیا شان و شوکت ہے ہوتی ہو کہ بس دل بھٹا پڑتا ہو خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ حامل بالحدیث ہیں آئین زور سے کہتے ہیں ان کی آہن کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھادی ہو“ مگر مولانا کی پابندی صوم و صلوٰۃ کی جو حالت تھی اس پر پوری روشنی نہیں ڈالی، لیکن اتنا بوقوف اور عینی شہادتیں کہا جاسکتا ہو کہ جس جمع بین الصلوٰتین پر تعریف ہو مولانا مہربانی کے قیام میں اکثر خود وہی جمع بین الصلوٰتین کیا کرتے تھے، کیوں کہ چوپائی اور اپا پو حسن مناظر اور خوبان زر و کشتی کے جمال سے لطف اندوزی کا وقت ہی مغرب کا ہوتا ہو۔

مصنف نے یہ واقعہ بھی بیان نہیں کیا کہ مولانا نے آخر زمانے میں کسی طبیب کے مشورے سے اینیون بھی شروع کر دی تھی (۷۷ حمید)

مصنف نے مولانا شروانی کے مضمون کا یہ اقتباس درج کیا ہو کہ ”عزیز نے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رلے سے نہیں ہٹتے تھے مخالفین کی مخالفت سے رو بردار نہیں رکھتے تھے مگر ان کے پس پشت بیان اختلاف میں بھی ان کی زبان

۱۵ اسی واقعے کو یہ تبدیل الفاظ سرسید سے کش کش اور اختلاف کے باب میں بھی لکھا ہو ”ایک دفعہ سرسید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تائیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے فرمایا کہ اس لیے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں مغرب کی افان اور نماز ہو جاتی ہو اور آپ شریک نہیں ہوتے وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے انہیں کیا معلوم کہ آپ کو سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں اور آپ دونا دونا ملا کر جمع بین الصلوٰتین پڑھتے ہیں“ (۲۸۸ حیات)

سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے
 مخالف کی رائے کی تردید سختی سے کرتے تھے اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار
 کرتے باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے
 اس کو ذلیل و رسوا کرتے ” (۶۲ حیات)

اب اس بیان کو محکم تنقید پر لائیے۔ مولانا کی زندگی کے کئی اہم سال وہ
 ہیں جو ندوہ میں گزرے اور یہاں ان کو مخالفین اور حاسدین سے آخر زمانے میں
 سابقہ پڑا اور اس اخلاق کے امتحان کا موقع آیا۔ مگر دیکھیے کہ ایک مخالف (معاصر
 عالم) اور دوسرے معاصرین کی نسبت (جن میں علما اور ذی رتبہ لوگ بھی تھے) اپنے
 خطوط میں جو تلامذہ راشدین کے نام ہیں پیر بے منز، سازشی، اشرار، منافقین،
 سنگان بازاری، پاجی، خبیث کے الفاظ تک لکھ دیے ہیں، کیا یہ نفسانیت اور
 معاندانہ عیب جوئی نہیں ہو اور کیا کسی کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ان الفاظ
 سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں انھوں نے ان کے جانشین نے
 جو حیات شبلی کے متصف ہیں ایسے خطوط شائع کر کے اخلاقی و قانونی جرم کے
 از کتاب تک میں باک نہیں کیا حالانکہ ان الفاظ کی جگہ نقطہ دیے جاسکتے تھے،
 جس طرح کہ بعض اور خطوط میں دیے گئے ہیں ممکن ہو کہ مولانا کی ہدایت ہی ایسی
 ہو کیوں کہ مولانا نے خود ان خطوط کا انتخاب کیا تھا جن کا مجموعہ شائع ہونے والا
 تھا، جیسا کہ مولوی عبدالسمیع کے موسومہ خط (سمیع علیہ) سے اندازہ ہوتا ہو،
 اسی طرح جب مولوی وحید الدین سلیم محض ہنگامہ کان پور پر مروجہ مضامین لکھنے
 کی پاداش میں مسلم گزٹ کی اوڈیٹری سے علیحدہ ہونے اور پھر حکماً لکھنؤ چھوڑنے پر
 مجبور کیے جاتے ہیں تو چوں کہ انھوں نے مولانا پر بھی معاملات ندوہ کے متعلق
 سخت سخت چینی کی تھی مولانا اپنے اطمینان اور سترت کا یوں اظہار کرتے ” ہاں

وحید الدین لکھنؤ سے تشریف لے گئے اودھ اس کثافت سے صاف ہو گیا اخبارات میں بھی یہ ذکر آ گیا ہو حقیقت میں اودھ نجاستوں میں آلودہ ہو رہا تھا حریت و آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں لیکن سفاہت اور حریت مختلف چیزیں ہیں“ (۹۴ سید سلیمان) اور جب مولوی ابوالکلام کا آتش ریز قلم معاصر علما اور امکان و پرائنگارے برساتا ہو تو مولانا خاموش رہتے ہیں۔

علی گڑھ والوں نے ہمیشہ مولانا کا احترام کیا ندوہ کی حمایت کی لیکن جب وہ کے معاملے میں اختلاف کی نوبت آئی اور اخبار البشیر میں چند مخالفانہ مضامین شائع ہوئے تو مصنف حیات کو ہی لکھا کہ ”وقت ایسا ہے کہ علی گڑھ والے جو ندوہ کے ابتدائی دشمن تھے البشیر وغیرہ اب ندوہ کی حمایت کے پردے میں اصلاح کے دشمن بن گئے ہیں اور میرے انتقام کے لیے ہر قسم کے ہتھان وافر اسے کام لے رہے ہیں“ (۹۵ سلیمان) اسی جذبے سے انھوں نے چند طنزیہ نظمیں بھی لکھیں جو ان کے کلیات اور حیات میں شامل ہیں، مسلم لیگ پر بھی جو طعن آمیز نظمیں ہیں وہ یہ سب ہمارا جہم و آباد اور بعض ارکان لیگ سے ذاتی مخالفت کے نتائج ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا میں جسارت کا فقدان تھا اور اپنے حریف کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے وہ کترلتے تھے۔ ندوہ کے تنازعات میں۔ دوسروں کو پردہ پگنڈا کی تدابیر بتاتے رہے اپنے خاص رفق کو ہدایات دیتے رہے لیکن خود مرد میدان بننے کی جرأت کبھی نہیں کی۔

سید افتخار عالم مارہروی مرحوم مولانا کے عقیدت مندوں میں تھے انہوں نے مولانا کی لائف لکھنا چاہتے تھے ان کی اس خواہش کے متعلق مولوی ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں کہ ”ہاں اور سنی، افتخار، الم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ملے مصنف حیات شبلی اور دیگر تلامذہ کے نام کے خطوط قابل مطالعہ ہیں۔“

ان ہی اکودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھوڑنا چاہتے ہیں اجازت اور حالات مانگے ہیں“ (صفحہ ۴) اس مختصر خط میں افتخارِ عالم سے زیادہ سنگین حملہ مولوی نذیر احمد پر ہے، حالانکہ اسی کتاب پر جو ریویو، کو اس میں لکھتے ہیں کہ

”مولانا نذیر احمد مرحوم اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو ان کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں ملک اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا اور مسرت کی بات ہے کہ یہ ضرورت بوجہ احسن پوری ہوئی..... بہر حال ہم مصنف کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ایک فاضل کی قدر دانی کا پورا حق ادا کیا اور وہ خدمتِ انجام دی جو زبانِ اردو کی طرف سے ایک فرض واجب الادا تھا۔“

(حیاتِ النذیر صفحہ ۱۲ و ۱۳) مولانا حالی کے متعلق مصنف حیاتِ شبلی نے عجیباً تعلقاتِ احترام و اعتراف دکھائے ہیں اور حیاتِ جاوید پر مولانا کے بھیا کر کے کو ذاتیات سے الگ رکھا ہے مگر جب ہم ایک پرائیوٹ خط میں یہ فقرہ پڑھتے ہیں کہ ”حیاتِ جاوید کی مذمت رائے پوچھتے ہو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا تم نقل نہیں جہتہ ہو پھر تقلید کیوں کرو اور وہ بھی پھوٹی امرت کی“ (صفحہ ۳۴) تو مولانا کے اخلاق پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

مصنف حیاتِ شبلی نے سرکاری اعزازات کے متعلق لکھا ہے کہ ”انگریزی گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب دیا اور مختلف علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ان کو ممبر بنایا دربار میں بھی بحیثیت شمس العلماء ان کی کرسی تھی، دربارِ تاج پوشی کے موقع پر بھی وہ شریکِ دربار ہوئے تھے اور شاہ ایڈورڈ نے ان کو مارنشا تھا“ (۸۱۴) علی گڑھ کے زمانے میں مولانا کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی کے فیوچر مقرر ہوئے تھے پھر ۱۹۰۷ء کے بعد جب کہ چھو بڑا سالانہ امدادِ ندوہ کی قیمت ایک مضمین سے ادا کر چکے تھے تو علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ممبر بنائے گئے، درباروں میں کرسی

کی بشارت تو غلبت خطاب کے وقت ہی مل چکی تھی اور یہ کوئی امتیازی چیز نہ تھی البتہ بادشاہ کا بار بختا ضرور ایک امتیاز ہو، یہ بار بختی بھی ایک تاریخی واقعہ ہو چیلے تو نام کی تصحیح کر لی جائے، شاہ ایڈورڈ نہیں بلکہ وہ (ملک معظم) جارج پنجم (قیصر ہند) تھے، دربار دہلی کے پروگرام میں ”درشن“ بھی تھا یعنی ملک معظم اور ”ملکہ معظمہ لال قلعہ کے درشن“ جو کہ میں رونق افروز ہوئے اور مذہبی رہ نما (جن میں مسلمان، ہندو، سکھ تھے) آداب بجالاتے ہوئے سامنے سے گزرے مولانا بھی ان ہی میں تھے، یہ ہو وہ بار ہو مولانا کو بخشا گیا تھا۔

مصنف نے کتاب کے دوسرے ہی صفحے پر سوانح کے مانعہ دہن کے بیان میں لکھا ہے کہ ”ان کی پوری زندگی کا خاکہ ان کے مکاتیب کے مرقع میں بہ آسانی مل گیا“..... اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف و اشاعت کے ذریعے حقیقت صاحب مکاتیب کے سوانح زندگی کے ذخیرے کو میرے ہاتھوں بلا قصد و ارادہ پہلے ہی محفوظ کر دیا تھا..... اس نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ”حیات شبلی“ حقیقت مولانا شبلی کی خود نوشت سوانح عمری ہو۔“

لیکن کس قدر حیرت کی بات ہو اور کس درجہ اخفائے حالات و واقعات کی بدترین مثال ہو کہ مولانا کی زندگی کا خاکہ کھینچنے میں ایک دوسرے مرقع خطوط شبلی کو قصد نظر انداز کر دیا گیا۔ ان خطوط میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انہوں نے فرمایا، مولانا نے ان خطوط میں تعلیم نواں پر جو وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہو بحث کی ہو، وہ عورتوں میں علمی مذاق کے متمنی تھے اور چاہتے تھے کہ عورتیں علمی کام کریں اور اس کے متعلق کس کس طرح ترغیب دیتے اور شوق پیدا کرتے تھے عورتوں کے حسن و جمال پر اپنی رائے ظاہر کی ہو، ان میں موبینتی کے متعلق جو کچھ لکھا ہو اسے

اندازہ ہو جاتا ہو کہ مولانا کو خود اس سے کتنا لگاؤ تھا اور وہ اس کے ابتدائی اصول اور قواعد اور راہگوں سے واقف تھے، مصوری اور نقاشی میں بھی صاحب نظر تھے، مولانا پردے کے حامی تھے لیکن بے پردگی کو چنداں معیوب بھی نہیں سمجھتے تھے، وہ عورتوں کی تعلیمی و معاشری اصلاح و ترقی کے لیے مخصوص زمانہ رسائل اخبار کی ضرورت محسوس کرتے تھے، باتوں باتوں میں اور لطیف جملوں میں بان کی اصلاح کر دیتے اور ادبی نکات سمجھا دیتے تھے مولانا خود ایک اسپیکر تھے اور آنکھ کھول کر انھوں نے اپنی قوم میں جو بڑے اسپیکر دیکھے وہ سب مرد تھے مگر ان کو بعض جلسوں میں جب غیر مسلم عورتیں بھی اسپیکر نظر آئیں اور انھوں نے ان کی قوت تقریر کا مشاہدہ کیا تو ان کی آنکھوں کے سامنے تاریخ اسلام کا وہ مرقع آگیا جس میں عورتوں کا کہاں خطاب تھا اور حسرت پیدا ہوئی اور جب یہ جو ہر عطیہ بگیم میں نظر آیا تو بے اختیار دل چاہا کہ عورتیں اس میں کمال پیدا کریں اور ذہن میں ایک اسکیم آگئی گویا یہ ایک ممتاز تھی کہ مسلمان عورتیں بھی اسپیکر ہوں وہ حسن و قبح خطابت کے بھی نقاد تھے آؤ وہ تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرزِ ادا کی خوبی کا لحاظ ہونا چاہیے بمبئی کے جلسے میں مسز نائیڈ و اگرچہ نہایت عمدہ بولیں ولیوری بھی اچھی تھی لیکن تصویر کی طرح غیر متحرک رہیں تقریر میں تمام اعضا کو زبان کا ساتھ دینا چاہیئے (خط ۷۱)

ان خطوں میں سب سے زیادہ دل چسپ وہ تنقید ہو جو اپنے یا اپنے کلام کے متعلق نہایت بے تکلفی اور سچائی سے کر جاتے ہیں یہ بات کہاں نصیب ہوتی ہو کہ خود مصنف اپنی زبان یا قلم سے اپنے کلام کے متعلق رائے لکھے۔

اس باب میں چند اخبار خاص کا نام بہ نام مذکرہ ہو لیکن زہرہ بگیم اور عطیہ بگیم اس زمرے اور تذکرے سے محروم ہیں کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ کیوں حلال

ان دونوں کے ساتھ مولانا کے تعلقات محبت و داد ان لوگوں سے جن کا ذکر کیا گیا ہو کچھ کم نہیں بلکہ بہت سوں سے زیادہ تھے اور اس کا اندازہ نہ صرف خطوں کے مضمون سے بلکہ ان کی تعداد سے بھی ہوتا ہے، مخصوص احباب میں مولانا شیردانی (نواب صدر یار جنگ) ہیں ان سے سلسلہ مراسلت ۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۱ء جاری رہتا ہے اس عرصے میں (۱۱۸) خطوط ہیں۔ ۱۹۰۱ میں مولوی حمید الدین سے خاص محبت و الفت ہے ۳۰ جون ۱۸۹۵ء سے اکتوبر ۱۹۱۱ء تک ۲۰ سال میں (۷۷) کی تعداد ہے۔ تلامذہ میں خاص درجہ خود مصنف کا ہے اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء (۸۲) ہیں مگر طینت گیم کے نام تین سال تین ماہ (۱۷) فروری ۱۸۹۵ء تا مئی ۱۹۱۶ء میں ۵۵ کی ہے اور زہرہ گیم کے نام ۱۸۹۵ء تا ۱۹۱۶ء () کی تعداد ہے جو اوسطاً اور نسبتاً سب سے زیادہ ہے پھر ان خطوں میں جو پیار اور محبت پائی جاتی ہے بہت کم دوسرے خطوط میں ملتی ہے، کیا مصنف نے ان کا تذکرہ مولانا کی شان تقدس کے خلاف سمجھا؟ (حالات کہ خود لکھتے ہیں کہ ”پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا (۲۲۸ جتیا) کیا ایک مرد کی بایوگرافی میں عورتوں کا ذکر اخلاقی بدنامی تھی اس کے متعلق مولانا کا ہی نقطہ نظر یہ ہے کہ ”عورت کا حال مردوں کے ساتھ کسی پرچے میں دیکھ کر ہم کیوں گھبرائیں گے خود قرآن مجید میں ایک سورۃ کا نام نسا ہے یعنی عورت، نبوی بیادریوں میں عموماً مردوں کے ساتھ عالمہ عورتوں کا حال تفصیل سے ہوتا ہے (۷۷۵) خطوط شبلی) ان کا ذکر تو مسکاتیب شبلی میں بھی ہو جو گویا خود نوشت داستان زندگی ہے۔ مصنف حیات شبلی نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق (معتد انجمن ترقی اُردو و کل ہند) پر بھی فرد جرم لگائی ہے، ایک جگہ جہاں کالج میں طلبہ کی زندگی میں علمی رنگ نہایا ہو۔ نے کا ذکر ہے چند نام گنا کر لکھتے ہیں کہ ”مولوی عبدالحق صاحب ناظم

انجمن ترقی اُردو (بہارِ شریعت کہ وہ مائیں) اسی آب و ہوا کی پیداوار ہیں (۱۱۵) کتاب
امہات اللہ جلّائے جانے کے سلسلہ بیان میں دوسری جگہ تحریر ہے کہ ”اس واقعہ
کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقی اُردو نے اپنے مقدمے حیات النذیر میں
مولانا شبلی کی طرف بہ واسطہ یا بلا واسطہ بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کر کے ایک
تاریخی جرم کیا ہے حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود ہی نہ تھے مولانا
شروانی صاحب نے جو شریکِ جلسہ تھے مقدمہ مقدمات عبدالحق (ص ۵) میں
اس واقعے کی پوری کیفیت لکھ دی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب
مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد و واقعات کی نسبت میں کتنی بے اعتدالی
برہتے ہیں“ (۴۹۶) مولانا کے اخلاق و عادات کے سلسلے میں تیسری جگہ رشاد
کہہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اُردو) نے کسی وجہ سے سلسلہ ۱۹۷۰ء سے
گوایا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کیا تھا کہ جاوے جائے پر اعتراض کریں مگر کبھی انھوں نے
اس کے سوا کہ ”یہ الزام صحیح نہیں“ اُن سے کچھ اور نہیں کہا (ہمارے معاصرین مولفہ
مولوی عبدالحق صاحب سوانح مولوی سید علی بلگرامی)۔ (۷۵۶)

۱۔ گراں پرہہ اٹھا کر دیکھیے کہ (۱) کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۷۰ء کے
خطبہ صدارت شعبہ اُردو میں مولوی عبدالحق صاحب علی گڑھ میں علمی ماحول پیدا
کرنے کے بیان میں کہتے ہیں کہ ”اس کے علاوہ بعض پروفیسر مثلاً پروفیسر آرنلڈ
مولانا شبلی، مولوی کرامت حسین اس پائے کے تھے کہ ان کی تعلیم گفتگو اور صحبت
صحیح علمی اور ادبی ذوق کی ضامن تھی..... شبلی، آرنلڈ، حالی، سرسید، کرامت
حسین کچھ اٹھ کے نہیں دیدیتے تھے یا کچھ گول کے نہیں پلا دیتے تھے ان کی زندگی
اُن کے انہماک اور ان کی صداقت کا اثر نامعلوم طور پر خود بخود نوجوانوں کی زندگی
پر پڑتا تھا“ یہ خطبہ مصنف کی نظر سے بھی گزرا ہے اور معارف ستمبر ۱۹۷۰ء میں

اس پر مختصر ریویو بھی ہو اب تاریخی جرم کی روئداد مصنف حیات النذیر، مولوی عبدالحق اور مولانا شیردانی کی زبان سے ہی سنیں لیکن پہلے مولانا نذیر احمد مصنف ہیات لائٹ کے متعلق مولانا شبلی کے جو جذبات تھے ان کو ملحوظ رکھیے "مولانا نذیر احمد اور مولانا میں اگرچہ وہ ربط و اخلاص نہ تھا جو مولانا کو مولانا حالی کے ساتھ اور مولانا حالی کو مولانا کے ساتھ، تاہم بالکل بے تعلقی بھی نہ تھی..... مولانا نے دسمبر ۱۹۱۷ء کی کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا تھا اس میں ان دونوں بزرگوں کے نام بڑی عزت سے لیے ہیں ۵۷ گداز ہر سوئے حالی آزادہ فکس، وہاں نذیر احمد طوطی شکر خانگر (۸۰۸ حیات شبلی) اگر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اس طوطی شکر خانکے متعلق مولانا ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "کانفرنس اب کی غالباً بھکی ہوگی مولوی حشمت اللہ درزاجیرت کی بڑ بہت سن چکے مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہو مولوی نذیر احمد، بھی غالباً چُپ ہیں اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا" (بنام محمد اسحاق علی مکتب حقیقہ اول)۔

۱۹۱۷ء میں مؤلف حیات النذیر نے مولانا شبلی سے خواہش کی تھی کہ وہ ان کی لائف لکھنا چاہتے ہیں اجازت و حالات عطا کریں، اس کے متعلق مولانا نے الجواب کلام آزاد کو لکھا کہ "ہاں اور سی افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہیں آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھو نا چاہتے ہیں اجازت اور حالات مانگے ہیں میں نے لکھ دیا ہو کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہو وہاں سے منگوا یہ بھی بتا تو نہ دو گے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی" (مکتب حقیقہ ۷۱)

حیات النذیر کے مصنف نے اشاعت سے قبل مطبوعہ لائف چند اصحاب کے پاس تبصرے کے لیے بھیجی تھی جن میں مولانا شبلی بھی تھے، اصل واقعہ کی

نسبت اس کتاب میں تحریر ہو کہ "شمس العلماء علامہ شبلی فرماتے تھے کہ اہمات الامۃ کی تصنیف کے بعد جب ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہونے والا تھا تو میں نے جلسہ کا اشتہار دینے ہوئے ہندستان کے نام ور علماء کی فہرست بھی مشترک جلسہ کے لیے چھانی تھی اس میں مولوی نذیر احمد کا نام بھی تھا وہ اشتہار کہیں مولوی نذیر احمد صاحب کے پڑانے حریف کے نظر پڑ گیا تو انہوں نے مجھے بھی صرف اس بنیاد پر کافر قرار دے کر فتویٰ چھپوا دیا کہ نذیر احمد کے نام کے ساتھ میں نے مولوی کیوں لکھا اور ان کو زمرہ علماء میں کیوں شمار کیا، علامہ موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ کتاب قابلِ سوختنی تھی اور میں نے بھی جلا دینے کی رائے دی تھی اگرچہ اس میں آگ لگانے والے جیسے میں شریک نہیں ہوا" (صفحہ ۲۲۸ حیات النذیر)

جن اصحاب کے پاس یہ کتاب بھی گئی ان میں سے مولانا حالی اور مولانا شبلی نے تبصرہ اور مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا، اس مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد سوچ اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر حکم دلائل اور پُر زور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہو گئی اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ محض فساد اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہو مگر جب مجھے اس واقعہ کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کا رخیہ میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا اور اب تک میرا خیال ہو کہ کچھ تعجب نہیں جو مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ جلا دیا ہو۔

مولانا شبلی نے تبصرہ لکھا جو اگرچہ مختصر ہو مگر جامع اور نقادانہ ہو صاحبِ سوانح

کے تبحر علمی اور فارسی نویسی پر بھی تعریفیں ہو لیکن مصنف نے اہمات الائمہ سے متعلق اپنی ملاقات میں جو پلئے مولانا سے منسوب کی ہو اس سے براہت و انکار نہیں اور نہ کتاب کی اشاعت کے بعد جس میں یہ مقدمہ (مع دیگر تبصروں کے) شامل ہو پبلک یا پرائیویٹ طور پر تردید کی،

اب ۲۱ سال بعد (اکتوبر ۱۹۴۷ء میں) مولوی عبدالحق کے مقدمات پر نواب صدریاء جنگ مولانا شروانی نے جو کچھ لکھا اور جس کے اسناد مصنف نے مقدمہ نگار کو مجرم قرار دیا ہو اس کو بھی پڑھیے (حیات شبلی میں صرف حوالے پر طال دیا ہو) "حیات النیر کے مقدمے کے متعلق ایک واقعے کا اظہار ضروری ہو، مولوی نذیر احمد خاں صاحب مرحوم کے رسالہ اہمات الائمہ جلائے جانے کے واقعے کو مولوی صاحب (یعنی مولوی عبدالحق نے بڑی دل سوزی سے بیان کیا ہو، ایسا کہ دل سوزی نے اس میں کباب کا چٹ پٹا پن پیدا کر دیا ہو، واجب الاظہار واقعہ یہ ہو کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء اس کے جلائے پر آخر تک آمادہ نہ تھے خود مولوی صاحب مرحوم کی تحریک تھی۔ اس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار سے بدل دیا اصرار نے شدت اختیار کی بلکہ دھمکی کی صؤرت جیسی کہ مولوی صاحب مرحوم کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی۔ مسیح الملک مرحوم نے (جو واسطہ تھے) بالآخر کہا کہ میں نے شیئر کو کھڑے میں بند کر دیا ہو آپ نکالتے ہیں اس پر جلسہ کر کے غور کیا گیا اور مؤلف مرحوم کی رائے کی تائید ہوئی چنانچہ رسالے جلائے گئے مٹی کا تیل لاکر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا وہ میں ہی تھا اتفاق یہ کہ جلائے کے بعد آندھی نے خاکستر اڑادی

انشاء مولانا نذیر احمد سے مراد ہو۔

بارش نے جبکہ صاف کردی اسی طرح ”بلاس“ سوئیچنے کا موقع کسی کو نہ مل سکا۔
 اس پر رے بیان میں نہ تو جلانے کے واقعے سے انکار ہی نہ مولانا شبلی کی
 برأت ہو نہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کی تردید ہی بلکہ واقعہ واجب الاظہار کی صورت
 بیان کی ہو نہ وہ کے ارکان و شرکا میں مولانا شبلی بھی تھے اگر مولانا شروانی کو
 ان کی برأت مقصود ہوتی تو صاف طور پر لکھتے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک
 نہ تھے مولوی عبدالحق نے ایک مستند روایت پر جو خود مولانا شبلی کی نظر سے گزر
 چکی تھی ان کو شریک جرم قرار دیا ہو اگر کاب جرم میں اعانت بھی تو جرم ہی۔

تیسری جگہ ہمارے معاصرین کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن کتاب کا صحیح نام ”چندیم ہضم“
 اب اس میں مولوی عبدالحق نے مولانا شبلی کے متعلق شمس العلماء مولوی سید علی بگڑی
 کے تذکرے میں بسلسلہ قیام سررشتہ علوم و فنون جو لکھا ہے وہ ناظرین خود ہی پڑھ کر
 مصنف حیات شبلی کی دلا دیں۔

(۱) انھوں نے شمس العلماء مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم
 سررشتہ علوم و فنون پر یہ شاہرہ (۱۵۸) ہوا اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی
 اچھا ہوا تھا مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلے میں شائع ہوئیں (۳۵۶ مقدمات)
 (۲) ایک روز مولانا شبلی مولوی عزیز مرزا مرحوم مولوی ظفر علی خاں مرحوم
 کے یہاں مدعو تھے بارہ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی ثنائت اساتذہ
 کے شرفِ نشستہ رہے جس سے سامعین ہنایت محظوظ ہوئے مرحوم نے ان کی درجۂ
 پر فورا کا مل ہر دو کا بہت عمدہ فتحہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستر روپے ہو مولانا
 گئی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ حبیب طالب علم جو خود کتابوں کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست
 رد نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ مرحوم نے ہوا المنظر بن بنیمید اپنے خرچ سے نقل کروا کر

مولوی شبلی کے نذر کی گئی انگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی موساسی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہو آپ وہ نسخہ بھجواد بھیجے مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت لکھا بلکہ یہ ایک تحریر فرمایا کہ چون کہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لیے آپ طلب کرتے ہیں۔ اس درشت اور عقاب آمیز خط کا یہ جواب دیا کہ پانسو روپی کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوادیں چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالمی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصابِ تعلیم مرتب کرنے کے لیے حیدرآباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے لیے مرحوم سے ملے انہیں لیکن کتب خانے کے جلسہ انتظامی میں اتفاق سے جب مڈ بھیر پڑ گئی تو مرحوم اسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا، (۳۶۳ و ۳۶۴ - قدمات)

(۱) بے تعصبی و غیرہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "ایک دن شمس العلماء مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے شیعوں کو کیوں عداوت ہو حالانکہ انہوں نے شیعوں کے رد و غیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں اگر آپ ہمارے بجائے ہونے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہو جی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ہماری آدمی سلطنت حسین بنی بولانہ نے پوچھا وہ کیوں کر فرمایا آدمی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر کی غزوئیہ زمرتی ہو اور اچھے بیٹھے ان کا نام نہ ہو اگر شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پریش کر دیتے، اگر اسی طرح آپ کی آواز، سلطنت عاتقہ رستمی کو ہم پر آئے پوچھتے کہ آپ کی فرمائے ہیں" ۳۶۵ - قدمات

(۲) مرحوم نے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی چنانچہ جب وہ وفات پائی تو اس سے وظیفہ لے کر انگلستان لے گئے تو وہی شریک سفر تھیں جس زمانے میں مولانا

شبلی مرحوم کے ہاں یہاں تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے یہاں ہیں بلکہ اُنٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکریہ گزار ہونا چاہیے آپ کو معلوم ہو کہ میری ایک بیوی تو اور پھر بھی ہیں اُسے تو میں نے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا پڑا۔ (۲۷۷ء مقدمات)

یہ تودہ اقتباسات ہیں جن کی نسبت مصنف حیاتِ شبلی نے اشارہ کیا ہے لیکن مقدمات سے ایک مزید اقتباس بھی اس موقع پر پیش کیا جانا چاہیے۔ مائرا انکوام کے مقدمے میں نصابِ قدیم کی خامیوں پر انہار اور اسے گرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”غرض صد سال سے ہمارے ہاں کی تعلیم حالتِ جمود میں تھی مابا سال کی بربادی اور تباہی کے بعد اب جا کر کہیں ہمارے علما کی آنکھیں کھلی ہیں اور آنکھیں کھلی ہیں مگر دینی چاہیے اس باہمت اور عالی دماغ شخص کو جس نے اُس زمانے میں مسلمانوں کے سر سے بہت سی بلاؤں کو ٹالا اور مسلمانوں کو ان کی نازک اور پرخطر حالت سے آگاہ و خبردار کیا یہ اُس کا طفیل نہیں تو اور کیا ہو کہ اسی کے صحبت یافتہ اور اُسی کے دارالعلوم کے تربیت یافتہ ایک بزرگ عالم (یعنی شبلی) نے قدیم سلسلہ تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور چنانچہ اس کے سیرے سارے ہوئے جاتے ہیں خدا اس کی ہمت میں برکت اور اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ (۲۷۷ء مقدمات)۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع پر مولوی عبدالحی نے نکتہ جینی بھی کی ہو لیکن ادب و احترام اور محکم دلائل کے ساتھ، اور یہ کوئی جوامانہ کی بات نہیں اسی طرح مولانا کی نسبت اگر کسی واقعے سے ”مصنف حیاتِ شبلی“ کے معیار سے گری ہو تو بات نظر آجائے تو اس کا بیان بہ نظرِ تحقیر نہیں قرار دینا چاہیے بلکہ بہ طورِ امر واقعہ ہی سمجھنا

کچھ متفرق

۱۔ (۱) مصنف نے مولانا کی تصنیفات کو ادب و انشا کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیتے ہوئے لکھا، ”کہ ”تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضرات علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا اور اب تو وہ علمی و مذہبی علوم کی نمکسالی زبان بن گئی“ (صفحہ ۳۴ حیات) اس کے بعد پھر دُور جا کر ایک برس تک قرات فاتحہ خلف الامام کا مقدمہ نقل کیا ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ”تاکہ معلوم ہو جائے کہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اُردو انشا پر دانی کا کتنا زور تھا نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ و سرسید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے ہی کس قدر تھا“ (۱۰۴ حیات) کوئی شک نہیں کہ مولانا کی تصنیفات ادب و انشا کے معیار سے بھی بلند درجہ رکھتی ہیں لیکن یہ بھی سرسید کا فیض تھا، خود مولانا لکھتے ہیں کہ

”سرسید کے جس قدر کامنامے ہیں اگرچہ رہنمائی اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہو، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے سرسید ہی کی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور و اثر و وسعت و جامعیت ساوگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہو کہ خود اس کی اُستاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے فن و فنون کے دائرہ مضمون کے حکم ران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں ہو سکتا ہے سیر بار احمد ان سے مگر دن اٹھا سکتا ہو بعض باکسل اُن کے دامن تربیت

صفحہ ۳۴ پر اس رسالے کی نیت لکھتے ہیں کہ ”مگر اس نہ اپنے نام سے نہیں چھوڑا۔“

میں پہلے ہیں بعضوں نے دُور سے فیض اٹھایا ہو بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا تاہم سرسید کی فیض پریری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے..... سلسلہ ۶ میں جس کو آج کم و بیش ۲۷ برس ہوئے سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اُردو انشا پر دازی کو اس رتبے پر پہنچا دیا جس سے آگے ایک تہم بڑھنا بھی ممکن نہیں..... زمانہ جانتا ہو کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں اُن کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تاہم اس سے جھک کر کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اُردو زبان میں ادا کیا ہو کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا سرسید اور اُردو لٹریچر مئی ۱۸۹۵ء)

مولانا کے یہ اعتراضات خود شاہد ہیں کہ ان کا ادب و انشا سرسید ہی سے فیض پریر تھا۔

مصنف رقم طراز کہ :-

مولانا شروانی سے تعلقات | الامامون اہل علم کی نگاہوں میں

اعتبار کے قابل بھڑی اس پر اخباروں میں بہت سے ریویو نکلے ان میں قابل ذکر ریویو اس زمانے کے ایک خوش مذاق فوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا جس کو ملک اب فواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شروانی کے نام سے جانتا ہو، مولانا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱ فروری ۱۸۹۵ء کے آزاد لکھنؤ میں اس کے اڈیٹر کے پُر درجی اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجیب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتے میں جکڑ دیا جو ایک کو مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا۔ مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ

”علامہ مرحوم سے میری سب سے اوّل ملاقات اندازاً ۱۹۳۷ء میں ہوئی
آغازِ تعارف اختلاف سے ہوا کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو
لکھا بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا“ غالباً ہی ایک ریویو تھا جس کا
علامہ شبلی نے جواب لکھا یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا ہے
رسی آں گہ بہ درد زن چون خامہ گیری و حرف بنگاری“

(۱۲ حیات)

اس ریویو اور جواب ریویو کی داستان خود علامہ کی ہی زبان سے سنیے اور
اس طریق تدلیس کو دیکھیے جو مصنف نے برتنا ہے۔ مولانا ڈیڑھ کو لکھتے ہیں :-
”جناب من، آپ کے متواتر خطوط پہنچے کہ میں ان تحریرات کی طرف متوجہ
ہوں جو المامون کے متعلق اخبار آزاد میں شائع ہوئیں بے شبہ آپ کا
مقصود و صرف یہ ہے کہ امر حق فیصل ہو جائے لیکن افسوس، یہ کہ نہ مجھ کو فرصت
اور نہ اس قدر عام رائیں لحاظ کی سستی ہیں آج کل جس کے ہاتھ میں قلم ہے
وہ بچلا نہیں جھٹ سکتا، میں کس کس کی طرف توجہ کر دوں گا، آپ کو بہت
بڑا شبہ یہ پیدا ہوا ہے کہ دولت عباسیہ میں رشید انتخاب کے قابل تھا
نہ مامون ریویو لکھنے والوں نے بھی اس بات کو زیادہ طول دیا ہے اس امر
اور تمام دوسرے اعتراضات کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے ہدایت
وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کیے ہیں اور ساتھ ہی باریک بینی
اور تازہ بینی اہول کا محکمہ شناس بھی ہوئے

اس عبارت میں مولانا نے کہیں خوشی مذاق تو جوان نہیں عالم کی رائے کو کوئی
خصوصیت نہیں بخشی بلکہ تمام رایوں میں شمار کر کے قابل لحاظ ٹھہرایا ہے اور نہ ان
کی معلومات تاریخی اور تازہ بینی اہول کی نکتہ شناسی کی کوئی قدر و منزلت کی پہچان

صاف صاف تحقیق کی ہو، اور اُن کو قابل الذکر شخصیت کے درجے میں بھی نہیں رکھا بلکہ اپنا مخاطب اڈیٹر کو قرار دیا ہو اور اڈیٹر کے ہی مقصود کو پیش نظر رکھ کر آئندہ تمام مضمون میں رشید و مامون کا مختصر موازنہ کرتے ہوئے رشد کی بُرائیاں بیان کی ہیں اور آخر میں لکھا ہو کہ

”المامون پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں وہ اسی طرح تفصیل طلب میں جس طرح رشید و مامون کا موازنہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں۔ آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو کبھی نام لوگوں کی تحسین سے خوشی ہوئی نہ اُن کے اعتراض سے رنج میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں مجھ کو چھوڑ دیجیے کہ رائل ہیروز کے باقی حصے پورے کر دے۔“

رسی آں کہ بدرد دمن چہ من خامہ گیری و حرث بنگاری

(مقالات شبلی جلد ششم المامون)

دیکھیے کہ علامہ شبلی نے ان ریویو نگار کو قابل خطاب بھی نہیں سمجھا تا مگر کاہتا نہیں اور اعتراضات کو فضول قرار دے کر جواب کا حجاز بھی اڈیٹر کو کیا ہو اور بے نیازانہ شعر کا مشار الیہ بھی اڈیٹر ہی کیوں کر کہا جاسکتا ہو کہ مولانا نے اسی ریویو کا جواب دیا تھا یہ رسیں عالم کی خوش مذاقی کی دلیل بنیں، ہوگی اگر اس کو وہ اپنی طرف منسوب کریں، البتہ مصنف کی نذر ہائے عقیدت میں یہ ہی ایک نذر ہو جو اس صدر نشین ریاست دہلی کے حضور میں پیش کی گئی ہو۔

(۲) فرض سے ٹیک دوشی دسمبر ۱۹۰۷ء تک چھ ہزار قرض کا ہوجھا تھا۔

مگر چند ہیمنوں کے بعد پانچ ہزار کسی طرح ادا ہو گئے اور صرف ایک ہزار بچ گیا (۱۹۰۷ء) اس قرض سے مولانا نے پریشان تھے کہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں اپنا محبوب کتب خانہ بھی

علاحدہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور اپنے حبیب لبیب شروانی کو جو اس مشاعرے کے خریدار ہو سکتے تھے مطلع بھی کر دیا تھا۔ لیکن پھر چند ماہ میں اس کا بڑا حصہ کسی طرح ادا ہو جاتا ہے یہ کسی طرح تو سمجھ میں نہیں آتا۔ بجز اس کے کہ اس ”کسی طرح“ کے پردے میں مولانا شروانی ہی ہوں یا کوئی اور، بہرہ فرح یہ کسی طرح بغیر اس دواہی کو (جس کا ہر جگہ مصنف نے بڑی آن بان سے تذکرہ کیا ہے) قربان کیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۳) دیسی زبان کی یونیورسٹی کی تحریک، ”ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونیورسٹی بنے تو ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونیورسٹی کی تجویز ناکام رہی صلاً۔ مگر یہ تحریک تو برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے کی تھی جس میں ہندو بھی شریک تھے۔ حکومت ہند اور وزارت ہند نے اصولاً تسلیم کر لیا مگر چونکہ یونیورسٹی کے معیار پر دیسی زبان میں کتابیں نہ تھیں اس لیے غلطی میں یہ تحریک نہ آ سکی،

(۵) ندوہ کی سرکاری امداد، ”ترک مولائے کے زمانے میں ندوہ نے اس رقم کو لینے سے انکار کر دیا بعد کو راجہ کشن پال سنگھ رئیس کوٹلر نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانے میں مولانا حبیب الرحمن شروانی کی سفارش پر دو بارہ جاری کر دیا جو اب تک جاری ہے۔“ (۴۷۷) عجیب کہ ندوہ نے تو انکار کر دیا اور صرف ایک شخص کی سفارش سے وزیر تعلیم خود بہ خود جاری کر دیتا ہے۔ مصنف نے واقعہ کی شکل نہایت مجتہدے طریقے پر بدلی، ترک مولائے کی حماقتوں میں سے یہ بھی ایک تھی۔ لیکن جب انتراجات کی دقتیں محسوس ہوئیں پھر طرح طرح کی عاجزیوں اور معذرتوں سے اُسی مُردار کی طرف دوڑے اور اسی حزم سے پیٹ پالنا پڑا، جس چیز پر علمائے کرام نے حرام کا ستفہ فتویٰ دیا تھا۔

(۶) امداد بھوپال کا اضافہ، یہ وہ احسانِ عظیم تھا جس نے مولانا جیسے خود و ارشاع کو بخیر کر دیا کہ وہ اپنی سپاس گزاری کو ایک قصیدے کی صورت میں ظاہر فرمائیں چنانچہ عمر میں پہلی دفعہ اپنی خوشی سے وہ مدحیہ قصیدہ لکھا (۴۸۹) گویا اب تک کے قصائدِ جبر یہ لکھے تھے، اسی صفحے سے پہلے صفحے پر سلیم صاحبہ جبرہ کے ایک ہزار کے عطیے کا بھی قطعہ شکر یہ ہو، اور عمر کے پہلے صفحے میں پہلا قصیدہ سرسید کی مدح میں بھی ہو (مولانا خود دار ضرور تھے مگر قومی معاملات میں یہ ہمیشہ بغیر جبر کے خوشی سے ہی مدحیہ نظمیں لکھتے تھے، جن کی تعداد بھی کم نہیں، حتیٰ کہ سر جو زف بک کی دعوت کے موقع پر ان کی بہترین نظم نظر آتی ہو)

(۷) ندوہ میں سر آغا خاں، آخر جو ری سلسلہ میں دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں جس میں مولانا وقف علی الاولاد کے مسئلے کو پیش کرنے کی عرض سے گئے تھے مولانا کی ملاقات سر آغا خاں سے ہوئی موصوف نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کیے اس تقریب سے مولانا نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ لکھتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کو دیکھتے جائیں جس کو انھوں نے بخوشی منظور کیا (۴۹۲) واقعے کو پلٹتے اور جھوٹ سیج کی آمیزش کی یہ حیرت انگیز مثال ہے۔ سر آغا خاں نے اب تک ندوہ سے کہیں دل چسپی ظاہر نہیں کی تھی مگر وہ مولانا سے اتفاق سے ملاقات میں ندوہ کے متعلق مشورے بھی کرنے لگے اور یہی تقریب ان کے معائنہ ندوہ کی بھی ہوئی؛ واقعہ یہ ہو کہ ہزبائی نس آغا خاں کو خود مولانا نے ندوہ کی طرف توجہ دلائی! اور چون کہ ان کے اثر سے مولانا کو فائدہ اٹھانا مقصود تھا اور موقع بھی نادر تھا کہ وہ لفٹنٹ گورنر (سر جان میوٹ) سے ملنے کے لیے لکھنؤ آ رہے تھے ان کو دعوت دی چنانچہ ہزبائی تشریف لائے اور نہ صرف اخلاقی طور پر ندوہ متبع ہوا بلکہ مالی طور پر بھی ہزبائی نس نے امداد کی ادرا سی تمتع اور امداد کا نتیجہ تھا

کہ سلسلہ ۶ میں جب ہزہائی من نے مسلم بڑی ورٹی فڈ کے لیے پنجاب کا دورہ کیا تو مولانا بھی لاہور گئے اور ایک بڑے جلسے میں اپنی نظم بھی سنائی جس میں ہزہائی من کی بہت کچھ مدح و ستائش تھی۔

۸۔ سیرت النبیؐ ، مولانا کی ندوہ کی تقریروں کا ذکر کرتے ہوئے سلسلہ ۶ کی ایک تقریر کے متعلق لکھتے ہیں کہ ”اس انقلاب کا راز ان دنوں حیرت نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڑھ کے مولوی شبلی کو ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا تھا جو ہمہ تن دل اور محکم محبت بن گئے تھے“ (۵۰۴) تعجب یہ کہ علی گڑھ سے جدا ہونے کے ۱۴ سال بعد تک بھی مولوی شبلی علی گڑھ کے ہی رہے جہاں رسولؐ کی محبت نہ تھی، جس تقریر پر مصنف کا یہ پاک ہو وہ ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء کی، یہ صفحات ۷۰۲ و ۷۰۳ پر عزم تالیف سیرت کے ذیل میں تحریر ہو کہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان کے ارادے نے عزم کی صورت اختیار کر لی چنانچہ محرم ۱۳۳۲ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا..... اب مصنف نے احادیث و سیر کا مطالعہ شروع کیا اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا نظر میں وسعت، دل میں تڑپ اور رُوح میں بالیدگی بڑھتی گئی۔ ان دونوں عبارتوں کو ملا کر پڑھنے سے مصنف کا پہلا بیان کس قدر عجیب معلوم ہو گا کہ ایک ہی دو سال میں یہ انقلاب ہوا، حالاں کہ اگر انقلاب مان بھی لیا جائے تو اس کے ایک ہی دو مہینے ہوتے ہیں، اصل یہ ہو کہ مصنف نے اس سلسلہ بیان میں بھی علی گڑھ پر ایک طنز کے لیے دقت کی گنجائش نکالی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہو کہ مولانا کے دل میں سیرت کا خیال بھی علی گڑھ ہی سے پیدا ہوا تھا جب کہ انہوں نے طلباء کے لیے سیرت پر ایک رسالہ لکھا اور یہ خیال بھی سرسید کی خطبات احمدیہ کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔

(۱۰) امداد سیرت کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ "منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہر بامی شاذاب سلطان جہاں بیگم فرماں روا اے بھوپال کے لٹریٹری سکریٹری تھے سرکار سے عرض کیا کہ حضور آج کو منین کی دولت لٹ رہی ہے آپ اس کو بڑھ کر کیوں نہیں اٹھا لیتیں یعنی ایک عاشق رسول مصنف گلے میں جھوٹی ڈال کر سیرت نبوی کی تصنیف کے لیے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہو یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے، یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اتر گئی انہوں نے اس جھول سادات کی رضامندی ظاہر کی منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا اور اپریل ۱۹۶۷ء کے شروع میں ان سے باقاعدہ درخواست منگوائی۔"

(۷۰۶ و ۷۰۵) ان فقروں میں جو ادبی شان ہو اس کو ہم ناظرین کے ذوقِ ادب پر چھوڑتے ہیں، البتہ خط کشیدہ الفاظ پر نظر ڈال کر یہ ضرور دیکھا جائے کہ کوئی سکریٹری اپنے فرماں روا آقا سے اس قسم کا گستاخانہ مخاطب کر بھی کر سکتا ہے، نیز اس موقع پر "رضامندی" کا لفظ تو انتہائی بھدا اور ناموزوں ہو مصنف نے راقم کے نام کے ساتھ لٹریٹری سکریٹری کا انتساب محض اپنی مہربانی سے کر دیا ورنہ نہ تو یہ عہدہ بھوپال سول لٹ میں ہو اور نہ کبھی راقم نے لکھا، واقعہ یہ تھا کہ جب النددہ میں مولانا نے اعلان شائع کیا جس میں چندہ کی بھی درخواست تھی تو راقم نے اپنے عہدے کے ساتھ اس کو توجہ فرمانے کی غرض سے پیش کیا سرکار نے ایسی سیرت کی ضرورت و اہمیت کا پورا احساس تھا اور حضور ممدو ص نے نارنگی تصور فرمایا کہ اس مقصد کے لیے چندہ کیا جائے اور جھول سادات کے لیے تمام مصارف کی خود کفالت فرمائی۔

تذکرہ شبلی

ولادت و تربیت اور تعلیم | مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں یہ مقام قصبہ بندول (ضلع اعظم گڑھ) پیدا ہوئے جب وہ طفلی میں پہنچے تو اعظم گڑھ میں (جہاں ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے) تعلیم کا آغاز ہوا، فارسی کی تکمیل اور عربی کی درجہ ثانوی تک تعلیم کے بعد غازی پور میں مولانا محمد فاروق چرباکوٹی کے سامنے زانوئے شاگردی تک کیا اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ زراں بعد رام پور میں کچھ عرصے تک مولوی عبدالمنن خیر آبادی کے حلقہ درس میں شامل رہے اور مولوی ابوشامہ حسین سے فقہ پڑھی یہاں سے لاہور گئے اور مولوی غنی اللہ سے عربی ادب کی تکمیل کی پھر سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث سے درس حدیث لیا۔ اس طرح ۱۹ سال کی عمر میں اس زمانے کے مشاہیر علماء سے معقولات و منقولات اور ادبیات سے مستفید ہوئے مگر دیگر فارغ التحصیل طلباء کی طرح دستاویز فیضیت یا کسی شعبے کی سند تکمیل حاصل نہیں کی،

حج اور مشاغل | ۱۸۷۷ء میں جب کہ ۱۹-۲۰ سال کی عمر تھی اپنے بعض اعراج کے ہمراہ حج و زیارت کو گئے واپسی کے بعد مولانا کے دو مشغلے تھے ایک شعر و سخن اور مطالعہ کلام اساتذہ دوسرا غیر مقلد کی تردید میں تصنیف و تالیف اور مناظرہ، مولانا اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور تسنیم تخلص تھا تصنیف و تالیف اردو فارسی اور عربی میں کرتے تھے ایک عربی رسالہ اسکاٹ الامتدی جماعت مقلدین میں بہت مقبول ہوا اور شام وغیرہ میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، بعض رسائل دوسروں کے نام سے شائع کیے۔

ناہل اور صھول معاش | مولانا آغازِ شباب ہی میں متاہل ہو گئے۔ اب سائل معاش کی طرف توجہ ناگزیر رہتی گھر میں زمین داری یعنی

اس کا کاروبار سپرد ہوا مگر طبیعت کے مناسب نہ تھا، اس زمانے میں اضلاع میں وکالت کے لیے یونیورسٹی اسناد کی قید نہ تھی اُردو میں امتحان پاس کر لینا کافی تھا باپ اچھے وکیل تھے مولانا بھی امتحان دے کر وکیل ہو گئے، چند مہینے کام کیا مگر یہ پیشہ بھی موزوں ثابت نہ ہوا پس لازمت اختیار کی اور تحصیل میں امین مقرر ہو گئے لیکن اس دلدل سے پھنسنے ہی محل آئے اور پھر مطالعہ اور درسِ تدریس میں مشغول ہو گئے۔

علی گڑھ سے تعلق | علی گڑھ تحریکیوں تو ۱۸۵۷ء سے شروع ہو چکی تھی لیکن صحیح طور پر اس کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوا جب کہ سرسید

احمد خاں نے انگلستان سے واپس آکر رسالہ تہذیبِ الاخلاق جاری اور انجمنِ اصلاح ترقی تعلیم مسلمانان (۱۸۵۷ء) قائم کی اس تحریک کا اثر پوری اضلاع میں بھی بہت کافی ہوا چنانچہ ۱۸۵۷ء میں جب مدرستہ العلوم جاری ہوا اور بعد ۱۸۵۷ء میں جب وہ کالج کی حیثیت میں آیا تو ان اضلاع کے اچھے اچھے مسلمان خاندانوں کے لڑکے اس جدید تعلیمی ادارے میں داخل ہوئے شیخ حبیب اللہ کے لڑکوں میں موزنا بھی تو مولوی بن چکے تھے سمجھلے لڑکے (ہمدی حسن) تعلیم کے قابل تھے جو کالجیٹ اسکول میں داخل کیے گئے، اکتوبر ۱۸۵۷ء میں شیخ صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے اور مولانا شبلی کو بھی ساتھ لائے سرسید سے ملنے کو گئے مولانا بھی ہم راہ تھے، اس زمانے میں سرسید کی یادگار کا چندہ جاری تھا باپ نے پچاس روپیہ چندہ میں نذر کیے اور بیٹے نے ایک قصیدہ (عربی میں) پیش کیا جس میں سرسید کے حسبِ نسب اور توفیقِ الٰہی وغیرہ کی تشریف و توصیف تھی۔

دوسرے سال مکتبہ میں عربی و فارسی کے ایک معلم (اسٹنٹ پروفیسر) کی ضرورت ہوئی، مولانا فیض الحسن صاحب کی سفارش کے ساتھ مولانا شبلی نے بھی درخواست پیش کی اور لنگھ، ماہانہ پران کا تقارر ہو گیا اور یکم فروری ۱۸۸۳ء سے مولانا نے کام شروع کر دیا۔

مولانا کی علمی تربیت | اب مولانا شبلی کو ایسا ماحول ملا جو ان کے فطری مذاق کے مطابق تھا اور جس میں ان کے قوائے علمی بیدار اور بھرپور مجلّا ہوں، سرسید کے حلقے میں اس وقت تک جو اصحاب داخل تھے وہ ملک میں اپنی علمی سادھ قائم کر چکے تھے اور (زیادہ تر) تہذیب الافلاق کے ذریعہ ملک میں ان کی شہرت پھیل چکی تھی یہ سب مولانا سے زچہ ۲۲ سالہ نوجوان تھے (عمر میں بڑے اور بعض تو بہت بڑے تھے) ان سب کے علمی کارنامے مولانا کی نظر سے گزرتے سرسید کی جو ہر شناس نظر نے شبلی کے نظری جوہر کو پرکھ لیا اور بہت جلد اپنی کوٹھلی کے احاطے میں ایک چھوٹا سا بنگلہ (جہاں اب تک شبلی کی بنگلیا کھلتا ہے) ان کے قیام کے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے کتب خانے سے استفادہ کی رہبری کی، یہ واقعہ ہو اور خود مولانا نے راقم سے بیان کیا تھا کہ جب وہ سرسید سے پہلا دن انٹرویو کئے لیے آئے تو سرسید نے ان کو کتب خانے میں بٹھایا، سینے دار الماریوں میں جملہ کتابیں تھیں اور قفل لگے ہوئے تھے مولانا کہتے تھے کہ میں، اماروں کے پاس کھڑے ہو کر کتابوں کے نام دیکھتا رہا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا تو سرسید نے کھلا بھیجا کہ آؤ جب میں دوسرے دن گیا تو پھر کتب خانے میں بٹھایا گیا مگر آج سب قفل کھلے ہوئے تھے اب میں۔ نہ کتابیں ہٹا کر نہ نیا مشورع کیا جو پکا فی وقت گزر گیا نہ پھر کل حاضری کا حکم ہوا اور دونوں دن کی طرح کتب خانے ہی میں

بیٹھا لیکن آج دو تین کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں میں نے کل جو کتا میں دیکھی تھیں ان میں سے دو چار انتخاب کر کے پاس رکھ لیں اور سڑک سے منہ ہٹ کر گیا جب کل کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت گزر گیا تو سرسید خود ہی تشریف لائے اور فرمایا کہ مولوی شبلی انٹرویو ہو گیا، جاؤ اور کام شروع کر دو، اس کتب خانے میں (زیادہ تر) مسلمانوں اور اسلام کے متعلق یورپ اور مصر و شام کی جدید مطبوعات داخل ہوتی رہتی تھیں، خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن لکھنے کے سلسلے میں اس قسم کا نادر ذخیرہ موجود تھا اسی کے ساتھ سرسید کی صحبت جس میں علی وقوی مذاکرات و بہتے تھے یہ جگہ خود دامن تربیت تھی اس تربیت اور ماحول نے نوجوان شبلی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جو ان کے بزرگ معاصرین میں ہوجکا تھا اور اس انقلاب کا پہلا اثر مولانا کی شاعری پر ہوا ہنوز کالج میں آئے ہوئے مہینہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ سربلار جنگ اول کی رحلت پر فارسی مرثیہ لکھا اور دوسرے سال ۱۸۸۷ء میں منشی صبح اسید بھی جس میں مسلمانوں کی غفلت و جہود سرسید کی منادی اور کالج کی ابراہیم خاں بیخ کے ساتھ قلم کو ابھارا یہی منشی ان کی قومی شاعری کا دیباچہ ہے اور یہ چراغ مولانا حالی کے چراغ سے روشن ہوا یہ ۱۸۸۷ء میں جب تعلیمی کانفرنس قائم ہوئی تو پہلی مرتبہ مولانا قومی پلیٹ فارم پر ایک مقرر کی شان سے نمودار ہوئے اور ایک رزلویشن کو پیش کرتے ہوئے دل نشین تقریر کی، دوسرے سال مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک تاریخی رسالہ پیش کیا جو کانفرنس کی طرف سے شائع ہوا اور سرسید نے اس پر ریویو کیا

ترقی | اس تین سال ۱۸۸۷ء تا ۱۸۹۰ء میں مولانا شبلی کے جو جو پر نمایاں ہوئے
 ... ان سے وہ اپنے بزرگ معاصرین کے جاذب توجہ اور مرکز امید بن گئے اور
 ۱۸۹۰ء میں مولوی محمد اکبر و فیض علی کی جگہ خالی ہونے پر درجے کی ترقی پائی۔

۱۸۹۰ء میں سید حالی شائع ہو چکا تھا۔

یعنی اب مولوی شبلی پروفیسر بنی ہو گئے، مشابہ میں جب پروفیسر آرنلڈ ایم نے جوہد تن ذوقِ علم تھے ایم اے اوکالج میں پروفیسر طرغیہ و منطوقی تھوڑے تو ان دونوں کے باہمی علمی تعلقات کا آغاز ہوا اور ایک نے دوسرے سے استفادہ شروع کیا۔

اپریل ۱۸۹۷ء میں مولانا نے علمی مقصد سے ترکی سیاحت بلا و اسلامیہ اور مصروفیات کا سفر کیا تین مہینے قسطنطنیہ میں مقیم

رہے اور زیادہ وقت کتب خانوں علمی شغلوں مدارس کے معاینوں میں گزارا ترکوں کی علمی و معاشرتی حالت پر نظر غائر دیکھی متعدد اہل علم سے صحیبتیں رہیں سلاطین کی رسم بھی دیکھی اور اس سے متاثر ہو کر ایک نظم بھی ایم اے اوکالج ترکی کے سرکاری حلقوں میں پہلے سے متعارف تھا اس لیے اس کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی خاص حلقوں میں مولانا کا اور زیادہ احترام ہوا غازی عثمان پاشا سے ملاقات ہوئی۔

اور (غالباً انیس کی تحریک سے) بارگاہِ سلطانی سے تہنہ مجیدی (درجہ چہارم عطا ہوا اور سلطانی فرمان میں کالج کے پروفیسر کی حیثیت ہی لکھی گئی مولانا نے قسطنطنیہ سے متعدد خطوط اپنے والد اور سرسید کو کچھ کبھی ان میں سے کسی کو ایک ہی خط لکھتے اور وہ دوسرے کے پاس بھیج دیا جاتا سرسید اپنے نام کے خطوط خواہ کتنے ہی مختصر ہوتے

انہی ثبوت گزٹ میں شائع کرتے رہتے، قسطنطنیہ سے مولانا ہر دو تین مہینے ایک بار ہوتے ہوتے ہوئے مہر کئے ان مقامات میں بھی وہی علمی مشاغل تھے اور علماء و فضلا کی صحبتیں برتتیں مصر میں جامعہ ازہر کا بڑے غور سے معاینہ کیا، غرض چھ ماہ بعد واپسی ہوئی اہل جہاز سے اتر کر سید سے ملی گڑھ آئے۔

کالج میں نہایت شاندار ترقی ہوئی اور اس کی اصلاح کی خیر مقدم کی تحسینیں پڑھیں گئیں ایک ڈنر میں

مولانا نے ایک نظم منقصر جاہ حالات سفر پڑھی۔

تخے کا عدم استعمال اور شمس العلماء کا خطاب

مشتعلہ میں برطانوی
رعایا کو ممالک غیر کے

مفتوں کے استعمال کی چپ تک لکھ سکتے قبل اجازت نہ حاصل کر لی جائے
مانعت کر دی گئی تھی اور مولانا کو بغیر اجازت ماقبل متذہب تھا اس لیے وہ اس
کو استعمال نہ کر سکتے تھے اور اس کا سبب ہی کو افسوس ہوا، ستر سید کو مولانا کے
ساتھ جو جربیانہ شفقت تھی انہوں نے اس اعتبار سے موجودی کے بدل کے لیے کوشش
کی کہ خود حکومت مولانا کی علمی خدمات کا اعتراف کرے سن اتفاق سے ستر سید مولانا
لفٹنٹ گورنر کا زمانہ تھا جو ستر سید نے نہایت دوست اور کالج کے بڑے تلامذہ
اور ہم درجہ تھے خود پر دہیروں کے لیے ایسے اعزاز کی مثال بھی موجود تھی یعنی ستر
سید کے حلقہ احباب میں مولوی ذکار اللہ خاں پروفیسر سنٹرل سید کالج کو "شمس العلماء
کا خطاب مل چکا تھا، ستر سید کی کونستنس کا مہاب ہوئی اور جوری ۱۹۵۷ء کے
خطبات نوروز کی فہرست میں مولوی شبلی کے ساتھ "شمس العلماء" کا خطاب تھا،
مولانا کالج میں ستر ہوئی اور صبح کو اطلاع ملتے ہی پچاس پچاس خوشی میں
کالج کو نذر کیے، طلباء اور اسٹاف کو جو ستر ہوئی..... وہ دعوت کی صورت
میں ظاہر کی گئی ایک بڑی دعوت جس میں ستر سید بھی تھے اور نواب محسن الملک
کی صدارت میں مولوی مفتی بڑی زوردار تقریریں جو نہیں سن الملک نے مولانا کے کلمات علمی
کو اپنے خاص انداز میں سراہا اور مولانا نے جو جوانی آفریں کی وہ بھی بہت پُر جوش تھی
جس میں خطاب کا شکریہ، حکومت کی تعریف، کالج کی عظمت اور اپنی اس رسمیت کا
ذکر جو اس ماحول میں ہوئی نہایت منف پزیری کے ساتھ کیا تھا

کالج بیگزین کی ادارت

۱۹۵۷ء میں کالج بیگزین کا سہول اور بیگانہ

انعام ہوا اس کی اشاعت و جتنوں انگریزی

اور اردو) میں قرار پائی۔ انگریزی حصے کے مسٹر بک پرنسپل اور اردو کے مولانا ابھی مقرر ہوئے اور مولانا نے اس میں دو ڈھائی سال تک نہایت بیش قیمت تاراجی مضامین لکھے۔

حیدر آباد سے وظیفہ | مولانا اگرچہ کالج میں بھی تصنیف و تالیف کرتے رہتے تھے لیکن ۱۸۹۶ء میں ان کو خیال ہوا کہ سموی درس ریس سے آزاد رہ کر تصنیف و تالیف میں مستقلاً مشغول ہوں ۱۸۹۶ء میں نواب سراسماں جاہ مدار الہام دوست آصفیہ نے مولانا حاتمی کا وظیفہ یا منصب اسی مقصد سے مقرر کیا تھا کہ ملازمت سے یکسو ہو کر قومی و علمی کام کریں اب نواب سروقالا ملازمت کا دور تھا اور وہ مولانا سے پہلی مرتبہ جب سرسید کی سمیت میں حیدر آباد گئے تھے اور پھر جب ۱۸۹۵ء میں نواب مدوڑج نے کالج و زٹ کی بھی اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اس لیے مولانا نے حیدر آباد کا رخ کیا اور وہاں مولوی عزیز مرزا اور مولوی عبد علی بلگرامی کی وساطت سے درخواست پیش کی جس میں اپنا مقصد بھی ظاہر کر دیا چنانچہ سوپرڈکا ہولو کا وظیفہ مقرر ہو گیا لیکن اس وقت مولانا نے کالج سے ح تعلق مناسب نہ تھا۔

کالج سے قطع تعلق | مارچ ۱۸۹۵ء میں سرسید کا حادثہ انتقال پیش آیا مولانا پر بھی اس کا سخت اثر ہوا اول طویل رخصت لی اور پھر اسی سائل استغفار سے دیا اس طرح مولانا کا پہلا دور زندگی ختم ہوا۔

پہلے دور کا کام | مولانا جب کالج میں ملازم ہوئے تو ۲۴-۲۵ برس کی عمر تھی لیکن جو آثار کہ ان کی پیشانی سے ہو دیا تھے ان کے باعث سرسید اور ان کے تمام رفقا ان سے محبت کرتے تھے اور ان جوہروں کے چمکنے کے آرزو مند تھے جو شبلی کی فطرت میں ولایت تھے خود مولانا میں ایک جذبہ جو سن تھا ان کے سامنے سرسید مولانا ندیر احمد، مولانا حاتمی محسن الملک، وقار الملک موسیٰ جبار علی

(اعظم یار جنگ) مولوی ذکا اللہ خاں مولوی سید علی دین و دیگر کے علمی و ادبی اور قومی و ملی جذبات کے نونے اور کارنامے تھے، استفادے کے لیے سرسید کا تادیر کتب خانہ کتابیں ہر روز بہ روز چکنے لگے، مولانا کے موضوعات شاعری اور تصانیف کے رُخ ہی بدل گئے، نظم میں قصیدہ عید فارسی اور اردو منہوی صبح امید سے اور تشریف گزشتہ تعلیم سے اس کی ابتدا ہوئی۔

اس دور میں مختلف مقالات و مضامین کے علاوہ الماسون دجس کی اشاعت سنائی پسر سید نے، دیباچہ لکھا، سیرۃ النعمان سفر نامہ تین، مستقل تصانیف کیں ایک رسالہ، ابوالاسلام (سیرت نبوی)، عربی کے مہتری طلباء کے لیے تالیف کیا، اللہ آبادی و دہلی کے نقاب فارسی کے لیے ایک مجموعہ مرتب کیا، سلسلہ نامہ و ابن اسلام میں انعامات کے لیے مواد جمع کیا بلکہ کتاب ہی شروع کر دی، سرسید کا خیال تھا کہ الفاروقی کو اگرچہ وہ اپنے معاصروں میں سب سے زیادہ اس کے لکھنے کے، ہیں لیکن فیہ افسہ کی ہفت، خان طونہ کر سکیں گے، اس لیے ان کا بہ اصرار مشورہ تھا کہ اس کی جگہ الخزلی لکھیں جو عملائے زمانہ کی، مبالغہ خیالات کے لیے ضروری ہو لیکن مولانا نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا الفاروقی کی تکمیل و اشاعت سرسید کے بعد ہوئی اور مولانا نے السنن الیٰ بھی بعد کو لکھی اور شائع کی۔

کارلج کے دور میں مولانا کی فارسی غزلیں اردو نظموں کے مقابلے میں زیادہ ہیں عموماً، مراو شاہ میر کی تشریف آوری کے موقع پر مولانا قصائد لکھتے تھے جیسا کہ خلیفہ سید محمد حسین وزیر پٹیا لہ نواب سر آسمان جاہ احمد نواب سرو قارا لامرا کی وزٹ اور حیدر آباد وند کے موقع پر جو قصیدے لکھے وہ ان کی فارسی شاعری کے بہترین نمونہ ہیں مشرور و زبجیک کے موز پر بھی ایک فارسی نظم (غمر) امنوں نے لکھی ۱۸۸۹ء کی کانفرنس کلکتہ کی بندگان فارسی کی قومی شاعری

کا پہلا نمونہ، جو قدحیہ، آبادی و ممالک اسلامیہ کے سفر پر بھی انھوں نے قاری میں
نظمیں لکھی تھیں

اردو میں متوسطی صبح امید کے بعد مسئلہ ۱۷ میں مولانا نے اپنے یہاں طلباء کے
اجتماع میں سترچرف ایک کو مدعو کر کے ایک قصیدہ پڑھا تھا جس میں طلباء کو دعا
کیا گیا تھا ایک ترکیب بند مسئلہ ۱۷ کی کانفرنس کے اجلاس میں اور ایک سہ سس
۱۸۹۲ء میں قومی تھیٹر (پتی ریڈنگ) میں پڑھا تھا ۱۸۹۹ء میں سید محمود
کی تقریب شادی کی تہنیت میں بھی ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں ان کے مخالفوں پر
بھی تہنیت کی تھی۔

عربی نظم میں پہلا قصیدہ ۱۸۸۷ء میں سرسید کی طرح میں ہر اور دوسرا قصیدہ
۱۸۹۱ء میں ان علمی جمعیتوں کے تذکرے میں جو حیدر آباد، آگرہ کے مورخ پر نواب
عادل الملک کے یہاں منعقد ہوتی رہیں۔ (یہ قصیدہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا
مولانا نے کالج میں آنے کے پہلے ہی سال انگریزی تعلیم کی اشاعت کی ضرورت
محسوس کی اور عظیم گڑھ میں ایک ٹینل، سکول قائم کرایا وہ ۱۸۹۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی
کے فیلو بھی منتخب ہوئے اور وقتاً فوقتاً جلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے اس طرح
یونیورسٹی میں قاری صاحب کا ایک ستون بن گئے۔ اس امر کا ہر شخص معترف ہو کہ
مولانا کے ذوق علم اور علمی انہماک کا طلباء بہت گہرا اثر پڑتا تھا اور اس زمانے
میں بعض طلباء تو ایسے اثر پذیر ہوئے کہ ملک میں انھوں نے شہرت و حیثیت حاصل کر لی
۱۸۹۷ء میں جب ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی تو سرسید نے

ندوۃ العلماء میں شرکت اس کی زبردست تائید کی کانفرنس میں تائیدی تجویز
پاس ہوئی ۱۸۹۷ء کے پہلے اجلاس میں علی گڑھ سے مولانا عبد اللہ انصاری ناظم
دنیا ت اور مولانا بشی نے شرکت کی، اور کالج میگزین میں مولانا نے اس کی رد واد

تاریخ کی یہ تحریک ان کے عین مذاق، خواہش اور امید کے مطابق تھی، انہوں نے عربی تعلیم کی موجودہ حالت کے نتائج اس کی اصلاح اور علم کی یک جہتی اور اتفاق کی اہمیت و ضرورت پر علی گڑھ کے ماحول اور بلاد اسلامیہ کی سیاست میں پورا غور کیا تھا اب اپنے نتائج غور کو ندہ کے جلسوں میں نہایت موثر طریقوں سے پیش کیا اور ایک بڑی جماعت کو اپنا ہم خیال اور موید بنالیا اور ندہ میں ان کی ایک سو تیر اور اہم شخصیت قائم ہو گئی

اگرچہ ۱۸۹۹ء میں ان کا ارادہ تھا کہ مستقل طور پر درستی و صحت و سفر کشمیر | ندوہ میں رہ کر اپنی بنیادیں کو عمل میں لائیں لیکن اس عرصے میں صحت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ درستی و صحت کے لیے پہلے کچھ دن کشمیر میں بسر کیے، یہ سال زیادہ تر علامت میں بسر ہوا

کشمیر سے واپسی کے چند دن بعد ۱۸۹۹ء میں طبی مشیروں کے تاہل بار نانی | مشورے سے دودھری مرتبہ تاہل کیا پہلی بیوی کا پانچ سال قبل انتقال ہو چکا تھا اب زیادہ قیام عظیم گڑھ میں رہا اور اس عرصے میں امام غزالی کی لائق کا خاکہ تیار کیا دس و تیریں اور نیشنل اسکول کی ترقی و استحکام کا مشغلہ رہا مولانا کا بہنابل ان کے فرزند کو جو اب نوجوان تھے نہایت پریشانی کا زمانہ | شان ہوا اور وہ قبل معتد ہی گھر سے ملاطعات و نشان

چلے گئے اور غیرانہ زندگی اختیار کر لی ہزار پریشانی و تلافی بسیار ان کا یہ تھا کہ وہ واپس لائے گئے، مگر میں مولانا کے والد نے رحلت کی انہوں نے حیرت کنویں ساندی کر لی تھی اور اپنی جائداد کا ایک حصہ بہہ کر دیا تھا مولانا کے تعلقات سونپلی ہاں اور ان کی اولاد سے اچھے نہ تھے اور جائداد کے متعلق نزاعات کا اندیشہ تھا مگر مولانا کی مصلحت سنجی سے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طرہ ہو گئے لیکن جائداد پر

قرضے کا بارگراں تھا اس سے نجات دلانے کا بھی سوال سامنے تھا ان پریشانیوں میں
 نمازہ اضافہ یہ ہوا کہ بعض فیہ و غرض اور حاسد با اثر اشخاص نے حکومت کو ندوہ کی
 طریقے بدگمان کر دیا یہ دور سرانٹوئی میکڈرائڈ لٹننٹ گورنر کا تھا جو فطری طور پر
 مسلمانوں کے مخالف تھے اور اردو کی جگہ ہندی کا اجرا کر چکے تھے جس کے سعلنی علی گڑھ
 سے سخت احتجاج ہو رہا تھا وہ اب ندوہ اور علی گڑھ کے سرکاری کے ارکان سے ناراض
 تھے اور اگرچہ مولانا کا اب علی گڑھ سے ان احتجاجی کارروائیوں سے تو کوئی تعلق
 نہ تھا مگر ندوہ کے ایک بڑے رکن تھے اس لیے مولانا نے بدگمانیوں کے نتائج سے
 محفوظ رہنے اور خانگی ضرورتوں کے دباؤ سے حیدر آباد جا کر قسطنطنیہ مناسب سمجھی۔

مولانا زوری سلطانہ میں حیدر آباد گئے اور مئی ۱۸۸۳ء
حیدر آباد کی ملازمت | سر رشتہ علوم و فنون کی نظامت پر ان کا تقرر ہو گیا؟

لیکن ندوہ سے ان کا تعلق بہر صورت رہا اگرچہ حکومت بدگمان کر دی گئی تھی کسی غلط فہمی
 کا رد وانی کا کوئی موقع نہ تھا مگر یہ بادل بھی سلسلہ غم میں ہی جھٹ گئے حکومت صوبہ
 کا جائزہ سر جیمس لاٹوش نے لیا جو ایک صاف دل اور بیدار منہ حکمران تھے علی گڑھ
 کی چوبیدگیاں بھی سمجھ گئیں اور ندوہ کے معاملات بھی صاف ہو گئے۔ اس کے چلنے
 علی افسل ہوئے نہ رہے مولانا کو جب موقع ملتا جنسوں میں تحریک ہوتے اہم مسئلہ
 تعلیم قدیم و جدید کے انضمام سے ایک نئے نصاب کی تیاری و تسلیم کا تھا مولانا اس
 کے زبردست محرک و موید تھے اویسا وجود شدید اختلافات کے انہوں نے اس کی
 ضرورت و اہمیت تسلیم کرائی لیکن نئے نصاب کا احرا نہ کہ اسکے پس کا ان کو سخت
 تعلق تھا ان کی تحریک سے اسی زمانے میں ندوہ سے ایک سالہ بھی حسابی
 ہذا رسالے کا خانہ خود ہی تیار کیا اور اس کا مقصد علوم اسلامیہ کا احاطہ طبق معقول
 منقول اور علوم قدیم و جدید کا موازنہ قرا دیا۔

نظامت سے استعفیٰ اور معتمدی
دارالعلوم ندوہ

۱۸۷۷ء میں مولانا نظامت علوم و فنون سے
استعفیٰ ہو گئے اور کھنڈو آگر اعظم نے دارالعلوم
ندوہ کی معتمدی کا جائزہ لیا اور بڑی کوشش و

محنت سے مجوزہ اصلاحات جاری کیں اور دارالعلوم کو جدید نصاب کے ذائد و بکات
کی ایک مثال بنادی راستہ بھی صاف تھا اور مولانا جو کوششیں کرتے تھے کامیاب
ہو جاتی تھیں، وہ اگرچہ دارالعلوم کے معتمد تھے مگر ندوہ کی ترقی و استحکام میں اتنا
بہتیار نہ تھا کہ وہ ہی مدبرانہ وہ بن گئے تھے، اور انہیں کا اثر ہر طبقہ میں کم نہ تھا۔

بیوی کا انتقال، بمبئی کا سفر و
قیام اور صحبتیں

ابھی مولانا کو کھنڈو میں زیادہ عرصہ نہ گزرا
تھا کہ بیوی کا انتقال ہو گیا، یہ مادہ
سخت ترین تھا جس کے مدد سے خود

مولانا کی ماں کے لالہ پڑ گئے، اور وہ تفریح و صحبت کے خیال سے بمبئی آئے جاتے
رہنا بمبئی کے مناظر اپار اور چوپالی کے نظاروں غویان زردشتی کے صن و جمال
اور جسے زیادہ خاندانِ نفسی کی دل چسپ اور علمی صحبتوں نے پچاس برس کی عمر اور
خود یہ مقدس مشغلے کے باوجود جذباتِ شباب تازہ کر دیے اور اگرچہ ارادہ شباب
تو نامکمل تھا مگر دل کی جوانی نوٹ آئی اور ۱۹ برس سے شروع شاعری کی جو صنعت
بمبئی ہوئی تھی اب یاد آئی اور دل و دماغ پر چھا گئی یعنی روزانہ کوئی نہ کوئی تازہ
غزل تصنیف ہوتی اور دل کا کانٹا زبان سے نکلا جاتا۔

۱۸۷۷ء میں ایک دن جب کہ مولانا اعظم گڑھ میں گھر پر تھے
خداوند گزرتا ہوا کہ باہر سے اندر جا کر زمانے کے غمے میں تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ
گئے پاس بی بند و بکھی ہوئی مٹی جس میں چھڑے کے کار توں تھے مولانا نے اٹھ کر
۱۸۷۷ء پہلے وہ علی گڑھ میں مقیم ہونا چاہتے تھے لیکن جب ندوہ ہاتھ میں آ گیا تو وہاں چلے گئے۔
(ربیع الاول ۱۲۹۸ھ)

دوسرے شخص کو دی اتفاق سے گھوڑا گر گیا بندہ ق کی زد ٹھیک مولانا کے پاؤں پر پڑتی اور مال سے صرف ایک بالشت کا فاسلہ تھا جسے کی ہڈی باکل چر رہی گئی اور بڑی جبراً ہو کر جوتے میں رہ گئی فوراً ڈاکٹری امداد آگئی اور بالآخر عمل جراحی سے نصف ہینڈ لی جڈا کر دی گئی، تین ماہ تک تکالیف اٹھانے اور بستر پر پڑے رہنے کے بعد زخم مندھ سا ہوا اور بمبئی جا کر مصنوعی پاؤ بنوایا اور پھر اکثر بمبئی جاتے آتے اور رنگین صحبتوں سے حظ اٹھاتے ہے۔

ندوہ کی ترقی حکومت کے تعلقات | باوجود ان حالات کے ندوہ کی ترقی
 امداد اور جلسہ سنگ بنیاد | کی تدابیر میں برابر متہک رہے اور
 اسلامی ریاستوں اور فیاض مسلمانوں کے علاوہ حکومت کے بھی مشورے میں ماموم دینی کی تعلیم کے لیے امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور ایک خوش سواد قطعہ آراضی بھی خاص رعایات کے ساتھ حاصل کی تو میرپس حکمران صوبہ کے ہاتھوں سے دارالعلوم کے سنگ بنیاد نصب کرنے کی تفریب بڑی شان سے ہوئی اس موقع پر جو ایڈریس پیش کیا گیا اور جو جواب ملا وہ ندوہ کی تاریخ میں سرکاری تعلقات کی اہم یادگار ہے۔

مولانا نے اس موقع پر علی گڑھ اور ندوہ کو باہم منسلک کرنے کی سعی کوشش کی ڈیڑھ علی گڑھ جا کر خاص اصحاب کو اور پھر طلباء کو مدعو کیا۔ نواب و ذوالفقار علی خان سکریٹری کالج صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو انٹرنل کرٹری کافرٹس ڈاکسٹر ضیاء الدین احمد پروفیسر اور دیگر اصحاب اور طلباء کی ایک جماعت نے اس تقریب میں شرکت کی ڈاکٹر ضیاء الدین نے سیمک لیٹرن (خاندان جادو) کے ذریعے سے علماء طلباء کے سامنے جدید علم ہیئت پر بکھر دیا غرض مولانا کی جدوجہد اور اہمیت نے سات سال کے غرض سے میں ایک طرف ندوہ اور دارالعلوم کو مالی و احاطہ ملی

حیثیت سے مستحکم کر دیا دوسری طرف حکومت کو اطمینان دلادیا جدید تسلیم یافتہ طبقے میں
 نمودہ کی ضرورت کا احساس ہی نہیں پیدا کیا بلکہ اس کو امداد کی طرف مائل کر لیا حتیٰ کہ
 ہنزہ بانی نس سرتاج خان کو بھی نمودہ کے محانتے پر آمادہ کر لیا اور ہنزہ بانی نس نے
 محانتے کے بعد امداد بھی مقرر کر دی۔ نمودہ کے ارکان میں کالج کے آنریری سکریٹری
 اور کھنڈ کے متعدد سابق طلبائے عالی کمرہ شامل و منتخب ہوئے لیکن بابریمہ کچھ ایسے
 ارکان بھی تھے جو مولانا کے اندر تاریخ مساعی پر حسد رکھتے تھے اقتدار و اختیار کی
 خواہش نے اس آفتن حسد کو اور بھڑکادیا تھا مولانا کا آمرانہ طرز فعل بھی بعض کے لیے
 ناقابل برداشت تھا ان وجوہ سے اختلافات پیدا ہوئے جو اندر ہی اندر بڑھتے رہے
 ان حالات میں رسالہ نمودہ کے ایڈیٹر مولوی عبدالکرم نے جون ۱۹۳۷ء کی اشاعت
 میں جہاد کے مناقب و فضائل پر ایک ادارہ شائع کیا مولانا نے اس زمانے کے
 سیاسی حالات اور مطالب و بلبان کے واقعات کے لحاظ سے اس کو نامناسب و غیر کیا
 اور چند مقامی ارکان کے مشورے سے ایڈیٹر کو معطل کر دیا۔ اب مخالفین کے باہنوں
 میں ایک حربہ آگیا اور دیگر ارکان نے اس کارروائی کو بے ضابطہ قرار دے کر نمونہ
 کر دیا اور مولانا کے خلاف اخباری پردہ بگڑنا شروع ہو گیا، اگرچہ دوبارہ ان کا
 ارکان نے دوسرے جلسے میں وہی کارروائی کی جو مولانا نے کی تھی، مگر ایک ہی
 مولانا معطل کر دیے گئے اب حالات بہت نازک ہو گئے مولانا کے مذہبی منفعات
 زیر بحث لائے گئے اور ایک کمیشن کی تجویز کی گئی کہ وہ مولانا کے اخراجات کی بھی جانچ
 کرے جو طلباء پر پڑ رہے تھے،

مولانا کا استعفا | ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد مولانا نے عہدہ سے مستعفی
 ہو جایا تھا مناسب سمجھا اور جولائی ۱۹۳۷ء میں یہی ہے استعفا

بے چینی اور اسٹراٹک
اور نتیجہ

ندوہ کے انتظامات میں اصلاحات کی ضرورت
حق مطالبہ اصلاح بھی جاری تھا اب مولانا
کے دستخط نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا طلبا

میں بھجان پیدا ہوا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مولانا بمبئی سے کھنڈاٹے طلبا نے خیر مقدم
کا جلسہ کیا اور اس میں ایسی تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں جن میں موجودہ ناظم پر بھڑائی
کے قائل تھے اور مخالف لوگوں پر حملے تھے۔

طلبا نے خارج اوقات مدرسہ میں مولانا سے بخاری مشرعی کا درس لینا شروع
کیا اس کو حکماً روک دیا گیا اسی طرح سالانہ جلسہ سیرت پر قیود عائد کی گئیں، ان دہود سے
طلبا زیادہ مشتعل ہو گئے اور یہ بھی واقعہ کہ اشتعال پیدا کرنے میں مولانا کے بعض عزیز
طلبا نے بھی حصہ لیا بعض کے نزدیک خود مولانا بھی اس شعلے کو بھڑکانے والوں میں تھے۔
غیاثی کے قبضے میں اس قسم کا تحریری شعلہ بھی موجود تھا۔ بہر حال مدجہ میں ایک
طالب علم نے اپنے استاد سے گستاخی کی اور اس کی تہیہ پر طلبا نے اسٹراٹک کر دی بعض
تارخ تحصیل سبز طلبا نے اس آگ کو اور بھڑکایا مولانا نے اسٹراٹک کی حمایت کی
اور ایک سنہوں سے مذہبی رنگ دے دیا اخبار الملأل نے جو ایک بااثر مذہبی واد
اخبار تھا طلبا کی حمایت اور مخالفین کے خلاف نہایت سخت اور ایک مضامین
لکھے اور بعض دوسرے اخبارات بھی اس کے ہم نوا ہو گئے اسی طرح مولانا اور طلبا
کے ملاقات میں پروا پانڈا اجاڑی تھا، لکھنؤ کا مقامی اخبار مسلم گزٹ سب پر بازی
لے گیا تھا لکھنؤ ندوہ نے اس تعلیمی مسئلے میں کانفرنس اور مدبرانہ دیوبند کے ارکان
کی رائے کو چکے۔ لب انڈیا ایک اور مطالبہ اصلاحات دونوں سوال ناوا ہو گئے۔
اور تمام مسلم پبلک و حضوں میں منقسم ہو گئی، کئی مہینے کے بعد اسٹراٹک ختم ہو گئی
اصلاحات کی ضرورت تسلیم کر لی گئی اور اصلاحی کمیٹی قائم ہو گئی۔ لیکن مولانا کا

ابن ندودہ سے تعلق نہ رہا۔

سیرت ابنی ۱۹۱۲ء میں مولانا نے ایک فصیح سرین سیرت ابنی کی تالیف طبع کرائی اور اندودہ میں ایک اسکیم شائع کی جس کو بروئے کار لانے کے لئے ایک رقم خطر کی ضرورت تھی جس وقت یہ اسکیم فردوس آغیاں ذواب سلطان جہاں بیگم فرماں روئے بھوپال کے سامنے پیش ہوئی تو حضور کلدھوئے نکل مصادف کی کفالت فرمائی اور مولانا نے دفتر سیرت قائم کر کے کام شروع کر دیا۔

قانون وقف علی الادلاد مولانا نے وقف علی الادلاد کو قانونی طور پر تسلیم کرانے اور قانونی شکل دلانے میں جو سلسلہ اور

تھکاوٹیں والی جدوجہد کی وہ ان کا سب سے بڑا کام اور احسان ہے جس سے ہر ماہ خاندان اقتصادی تباہی اور جانناوی بربادی سے بچ گئے اور امور خیر کی آمدنی کا بھی ذریعہ ہو گیا۔ مولانا نے سلسلہ ۶ میں یہ تحریک اٹھائی ترم علی کو متفق کیا۔ متعین کی مدد حاصل کی مذہبی نقطہ نظر سے اس کے مسائل و اصول مدون کیے حکام سے ملا تا کہ جس جاہ جاسو کیسے تیب سلسلہ ۹ تک مجلس متعین سے پرزوریت سرخار یہ قانون پاس ہوا چون کہ قبل ازیں دو مرتبہ یہ تحریک سرسید اور تیسرا میر علی اٹھا کہ ناکام ہو چکے تھے اس لیے یک گونہ مایوسی ہوتی تھی مگر مولانا مایوس نہ تھے مایوس نہ ہونے کے تھے وقت ماعد تھا اور کوشش پیہم کا مایوس ہوئی۔

دیگر قومی خدمات ۱۹۰۳ء میں جب کانفرنس نے شبہ نرقی اردو قائم کیا تو مولانا اس کے معتمد منتخب ہوئے اور مایوس ہو گئے مولانا

حیدر آباد میں ناظم سررشتہ علوم و فنون تھے لیکن اس شبہ کے کام کو دل چاہی سے کرنے سے اس کی روپوشی شائع کی اور متعدد اچھی کتابیں ترجمہ تصنیف ہوئیں لیکن دیگر مصروفیات کی وجہ سے سلسلہ ۷ میں متعین ہو گئے سلسلہ ۸ میں صوبہ متحدہ کی دیگر اسکیم

کی سرکاری کمیٹی میں جب ممبر مقرر ہوئے تو اردو کے تحفظ میں نمایاں حصہ لیا، اسی سال مسلم لیڈی دوسٹی کی تحریک لڑی تو ہزاریوں آغاخان کے ہمراہ پنجاب گئے اور لاہور کے جلسہ میں ایک محکمہ کی قائم ہو گئی، غورنڈیشن کمیٹی کے بھی ممبر تھے، سرکاری نصاب تعلیم میں عامۃ جو تازہ نئی داخل ہوتی ہیں ان میں دانستہ اور نادانستہ طور پر ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو مسلمانوں کے خلاف زہر کی طرح موثر ہو جاتی ہیں مولانا نے اس زہر کے دفعیہ کے لیے زندہ ہیں ایک میٹھ، افلاطون تاریخی قائم کر دیا، اگرچہ مستقل نہ رہا تاہم مشترک کی تاریخ کی اصلاح ہو گئی اور عام خیال ایسی غلطیوں اور اصلاح کی نظر رجوع ہو گیا۔

مولانا نے فقہ ارتداد کے انداز کی طرف بھی توجہ کی اور زندہ ہیں ایک جماعت خدام الدین بنائی لیکن ارکان کی سرد مہری سے ناکامی ہوئی۔
 میں مولانا کی کوشش سے ایک صاحب کھنڈے "مسلم گزٹ" نامی اخبار نکالا جس میں مولانا بھی مضامین لکھتے تھے ان مضامین میں ایک مضمون "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے عنوان سے کئی نبروں میں شائع ہوا جس سے مولانا کے سیاسی موقف کا پہلی عربی جیک کو علم ہوا۔

اس دوسرے دور میں ہی مولانا کی مستقل تصانیف کی مستقل تصانیف

کافی تعداد ہو، الفاروق، الفزالی، علم الکلام، الکلام
 سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دہر، شعر العجم کالی سے جانے کے بعد مختلف
 ادبیات میں تصنیف کیں۔ مقالات و مضامین کی بھی بہت بڑی تعداد ہو جن
 میں عربی زبان کا رسالہ ہوسر کے مشہور سیاسی متعصب جرحی زبان کی تاریخ تمدن
 اسلام کا متعصب ہوسر، تنبیہ زیادہ ہو جو مصر وغیرہ میں بھی بہت مقبول ہوا
 اس وقت ہندوئی کے ہندوئیوں میں یہ وہ سرکاری تصنیف ہو۔ البتہ فرق یہ ہے کہ

۱۱) اول تصنیف کا تعلق خانہ جنگی سے تھا اور اس تصنیف میں غنیم کے حملوں کا جواب دیا۔

سیرت النبی کی جلد اول بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی تو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ سلسلہ میں جب اس کا دیا چھ الہلال میں شائع ہوا اور حاسد و لہجہ سروایوں نے نزعہ کیا اور مختلف طریقوں سے کوشش کی کہ بھوپال کی امداد تباہ ہو جائے با اس یہ اجساب تمام ہو کر ناکامی ہوئی

بہی میں جس شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ دستہ نکل **سلسلہ شاعری** اور پورے نکل پر حاسد ہی ختم ہو گیا اور اب تاریخی روایات اور واقعات حاضرہ کو نظم پر ڈھالنا شروع کرنا اور ان میں طعن و طنز کی بھی نئی راہ نکالی جو عموماً اپنی نافع نہ رہتی تھی۔

مولانا کے رکابت کے مجھ سے بھی شائع ہو چکے ہیں ایک مجموعہ **مکاتیب** دو جلدوں میں مکاتیب شبلی کے نام سے ان کے جانشین بروہی سید سلیمان نے شائع کیا اور دوسرے مجھ سے خطوط شبلی کی جو مکتبہ بیگم اور دوسرے بیگم کے نام کے خطوط ہیں) راقم نے اشاعت کی۔

مولانا کی زندگی کا آخری کا نامہ رفیع جباریہ **دار المصنفین کی تاسیس** ۱۹۱۳ء میں دار المصنفین کی تاسیس ہوا جس کے لیے اپنا باغ اور بنگلہ اور کتب خانہ (جو مدد سے بیچ گیا تھا وقف کر دیا تھا)۔

مولانا نے ۸ مارچ ۱۹۱۴ء یوم چہار شنبہ کو چند روزہ علالت کے بعد عظیم گڑھ میں رحلت کی اور دار المصنفین کے احاطے میں دفن ہوئے۔

اگرچہ ان کی زندگی طویل و عریض نہ تھی اور صرف ستادین برس کی عمر پائی لیکن جس قدر زندگی تھی وہ سرتایا علمی و قومی و دردی اور خدمتِ علم کے جذبے سے معمور تھی حقیقت میں یہ سرسود کا ہی فیضانِ صحبت اور علی گڑھ کی تربیت کا نتیجہ تھا، اس دور میں اور بھی بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے لیکن کوئی دوسرا جیسا نہ ہوا جس نے علمی و قلمی کارنامے اتنے ہمہ گیر اتنے روشنی ایسے، لیلِ راہ اور اتنے پائدار ہوئے، اگر شبلی اس راستے پر نہ بڑھ جاتے جس کو نواب صدر یار جنگ نے ان کے علم و شہرت سے کما کما سنہ قرار دیا تو وہ تو تربیت و فیض حاصل نہ کرتے جس نے علامہ شبلی کے ہی اعتراف کے مطابق ان کو شبلی بنا دیا تو عام نادوں یا نیم علماء یا علمائے حقہ کی ہی طرح مناظروں اور قوم میں انتشار و خلفشار پیدا کرنے میں ہی زندگی گزارتے وہ وہ روشنی نہ دیکھ سکتے جو انہوں نے دیکھی اور دوسرے علماء کو دیکھانی چاہی۔

انتہائی اور اسلامی طرز حکومت

شاید اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ انوشا کے تمام لکچر میں ہمیشہ حکومتِ شخصیت ہوتی آئی ہے جس کو یورپ کی زبان میں مائٹری کہتے ہیں یعنی وہ حکومت جس میں حکومت کی طاقت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو جس کو بادشاہ یا راجہ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر یہ بات غور کے لائق ہے کہ ہمزیرہ عرب میں بہ زمانہ جاہلیت یعنی قبل اسلام کیا طرز حکومت تھی اور اسلام نے اس میں کچھ تبدیلی کی تو کیا طرز حکومت قرار دی۔

زمانہ جاہلیت کی تاریخ بہت کم ملتی ہے مگر جس قدر ملتی ہے اس سے ظاہر ہوتا

نہ زمانہ جاہلیت میں شیوخ یعنی سرداران قبائل کے ہاتھ میں ہر ایک قبیلے کی حکومت ہوئی تھی۔ جو شخص بہ سبب دولت یا بہ وجہ کسی صفت کے تمام قبیلے میں اعلیٰ گناہا تھا وہی اس قبیلے پر حکومت کرتا تھا اور مجبوراً شیوخ تمام قبائل کے جزیرہ عربیہ کی طرح حکومت کرتے تھے صلح و جنگ، انفصال و خصلت! اجماعیہ یعنی شیوخ کے ہاتھ میں تھا اس طرز حکومت کو یورپ کی زبان میں (آلی گامہ کی) سے تعبیر کیا جاتا تھا جو جس میں اعلاقت حکومت کی پسند نالی رتبہ نام و راسخ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

زمانہ اسلام میں آں حضرت صلعم کے وقت تک یہی طرز حکومت قائم رہی۔ تمام قبائل جزیرہ عرب کے اسلام لائیکے تھے اور عرب کے قبائل میں جو بہا اہل شیوخ ہوتے تھے ان کا تعدد اسلام کے توحد نے مٹا دیا تھا اور سرن ایک ذات پاک آنحضرت صلعم کو کل قبائل نے اپنا شیخ اور بغیر قبول کیا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ رسالت کے ساتھ جزیرہ عرب کے کل قبائل کی حکومت بھی لازماً حسب دستور جزیرہ عرب آں حضرت صلعم سے از خود منظم ہو جائے اور مثل ایک شہنشاہ یا شیخ الیون کے ملکی و تمدنی امور کا انتظام بھی آں حضرت صلعم کے ہاتھ میں رہے۔

یہاں تک جو طرز حکومت عرب کا بذریعہ شیوخ کے زمانہ جاہلیت میں تھا اس کے اصول میں کچھ فرق نہیں آیا تھا بہر حال اس کے کہ جدا جدا قبیلوں کے جو جدا جدا شیوخ تھے بہ سبب متحد ہو جانے قبائل کے وہ تعدد معدوم ہو گیا اور ایک ہی شیخ تمام قبائل کا ہو گیا جس کے ہاتھ میں کل جزیرہ عرب کی حکمرانی تھی بے شک اس طرح پر کل قبائل کا جو مختلف مذاہب رکھتے تھے اور ان کے آپس میں نسلاً بعد نسل عداوتیں چلی آتی تھیں متحد ہو جانا ایک کرشمہ ربانی تھا جس کی نسبت خدا نے فرمایا۔

گم بحث اس یہاں کہ اسلام نے کوئی طرز حکومت قرار دی اور اگر کوئی قرار دی تو اس پر کیا عمل درآمد ہوا اس زمانے کے تعلیم یافتہ جو بے سمجھے ری پبلک ہوں

کی طرف رجحان رکھتے ہیں اور مجھ کو کہنا چاہیے کہ اسی کے قریب قریب اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ آں حضرت صلعم نے طرز حکومت انتخاب کے اصولوں پر چھوڑ دی تھی یعنی جس کو سب لوگ منتخب کریں وہی حاکم یا امیر یا خلیفہ یا سلطان قرار پادے اور اعلیٰ حکومت اس کے ماتھے میں ہو جو ری پبلک کا اصول ہو مگر اس اصول کو اسلام سے متعلق کرنا صحیح نہیں ہو کیوں کہ کوئی ثبوت اس کا نہیں ہو کہ آں حضرت صلعم نے فرمایا ہو کہ میرے بعد لوگ جس کو انتخاب کریں وہ میرا جانشین ہو اگر فرض کیا جائے کہ آں حضرت صلعم نے امر جانشینی کو بلا کسی ہدایت کے چھوڑا تھا تو یہ کہا جائے گا کہ جانشینی کی نسبت کوئی ہدایت نہیں کی تھی نہ کسی کے استخلاص کی نہ انتخاب کی نہ جانشینی کی نسل یا قربت قریبہ میں جوئے کی۔

علاوہ اس کے ری پبلک کا اصول یہ ہو کہ کل لوگ خود یا بذریعے اپنے نائبوں کے انتخاب میں شریک ہوں مگر ایسا نہیں ہو کیوں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جو لوگ جمع ہوئے اور جہاں حضرت ابوبکر جانشین قرار دیے گئے تھے وہ لوگ عام لوگوں کی طرف سے کسی جانشین کے مقرر کر کے مجاز نہیں ہوئے اور ان لوگوں نے اپنا دوبریڈنٹیٹو سفر کیا تھا اور اس کے لیے لازم آتا ہو کہ وہ انتخاب ری پبلک اصول پر نہ تھا اور اسلام نے کوئی ایسی پبلک طرز حکومت قرار نہیں دی تھی نہ اس پر عمل درآمد ہوا۔

اہل سنت و جماعت بھجائے لفظ ری پبلک کے لفظ اجماع امت استعمال کرتے ہیں اور حضرت ابوبکر کی خلافت باجماع امت قرار دیتے ہیں مگر کلام اس میں ہو کہ آیا اسلام نے یہ طرز حکومت قرار دی ہو یا نہیں اگر ہم تسلیم کریں کہ یہی طرز حکومت اسلام نے قرار دی تھی تو اس میں کئی مشکلیں ہیں آئی ہیں اول یہ کہ اجماع امت کسی امر پر متفق ہو ہی نہیں سکتا دوم یہ کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں تمام لوگ جن پر اہل سنت و جماعت

ہونے کا اطلاق ہوسکے جتنے اہل سنت اور بعد جانشین ہوجانے کے لوگوں کا ان کی حکومت کو تسلیم کر لینا اجماع مطلوب میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ بعد حاکم ہو جانے کے ہر ایک حاکم کی حکومت لوگ تسلیم کر لیتے ہیں وہ تسلیم اجماع مطلوب داخل نہیں ہو سکتی۔ مدیم یہ کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنی اخیر زندگی میں اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا ان کی ولی عہدی خلافت کا فرمان جاری کیا پس اگر خلافت امت اسلام نے انتخاب یہ چھوڑی ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ اپنا ولی عہد خود مقرر کرتے۔

ہاں ایک اور مقول دلیل اہل سنت و جماعت پیش کر سکتے ہیں مقتضین علماء اہل سنت و جماعت کا اجماع کی نسبت یہ مذہب ہے کہ اجماع مفہد ہونے کے لئے کوئی اہل قرآن و حدیث میں موجود ہونی چاہیئے یعنی قرآن و حدیث میں کوئی حکم ہو جو بطور نص قطعی کے ہو بلکہ اس میں کچھ ابہام ہو تو اجماع اس ابہام کو رفع کر کے اس حکم کو قطعی کر دیتا ہے اس صورت میں حضرت ابو بکرؓ کی خلافت پر اجماع ہونے کی یہی مراد لی جاسکتی ہے کہ آنحضرت صلیع نے زمانہ علالت میں حضرت ابو بکرؓ کو بجائے اپنے نماز پڑھانے کا حکم دیا اور نماز میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اس حکم میں یہ ابہام رہا کہ اس سے آنحضرت صلیع کا منشا اپنے بعد بھی حضرت ابو بکرؓ کا خلیفہ ہونا تھا یا نہیں اس پر اجماع ہوا اور حضرت ابو بکرؓ سے استخلافت خلیفہ ہوئے اگر یہ دلیل تسلیم کر لی جائے تو لازم آتا ہے کہ اسلام نے طرز حکومت کو انتخاب کے اصول پر نہیں قرار دیا تھا بلکہ استخلافت کے اصول پر قرار دیا ہے۔

شیعہ تو اس سے بھی زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں وہ خلافت یا امامت کا تصور میں اشر قرار دیتے ہیں اور طرز حکومت اسلامیہ کو استخلافت پر منحصر کرتے ہیں اور یہی ہیں کہ استخلافت حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا تھا مگر اس مقام پر ہم کہ اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ استخلافت کس کے حق میں ہوا تھا حضرت ابو بکرؓ رضی اللہ عنہ کے

حق میں یا حضرت علی مرتضیٰؑ کے حق میں بکاہ صرف یہ مقصود ہے کہ ان دونوں مذہبوں سے اسلامیہ طرز حکومت استخلاص پر مبنی جوتی ہے نہ انتخاب اور پبلک اصول پر۔ حضرت عمرؓ نے بھی اخیر وقت پر متعدد لوگوں کو استخلاص کے لئے نامزد کیا مگر زندگی نے وفات کی در نہ ان میں سے ایک کو متعین کر دیتے۔

حضرت علی مرتضیٰؑ نے بھی اپنی مرضی حضرت امام حسنؑ کے استخلاص پر بظاہر کی مگر بہ لحاظ حالات زمانہ اور واقعات موجودہ کے جو کچھ تردد تھا یہ تھا کہ وہ چل بھی سکے گی یا نہیں ہمارے دامنست میں اگر ابتدا ہی سے اصول حکومت فی النسل بطور اصول لیٹھا مانر کی کے قائم ہوتا تو اتنا جلد زوال نہ آتا۔ الامیتہ من القریش اگر حدیث صحیح ہو تو اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ خلیفہ اربعہ میں سے کسی نے کبھی نظام حکومت اور اجراءے احکام سلطنت کو تابع رائے عام نہیں کیا بلکہ صلح و جنگ وغیرہ تمام امور صرف اپنی رائے اور مرضی کے موافق انجام دیے اور سب نے ان کے حکم کی اطاعت کی اور یہ طرز حکومت وہ ہے جس کو دمانہ کی یعنی سلطنت شخصہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایک اصول بھی طرز حکومت ریپبلک کا اس پر صادق نہیں آتا۔

اس تمام بحث سے ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام نے طرز حکومت ریپبلک اصول پر قائم کی تھی اور مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا اس لئے ان پر زوال آیا یہ صحیح نہیں ہو بلکہ خلافت حضرت عمرؓ میں جو یقینی بہ استخلاص قائم ہوئی تھی جو شان و شوکت و ترقی اسلام و مسلمانوں کی ہوئی اس کی نظیر کسی خلافت یا بادشاہت میں پائی نہیں جاتی۔

ختم نبوت کے بعد خلافت فی النبوت باقی نہیں رہی تھی ہاں مسلمانوں کے اہم ترین کے انتظام کو کسی امیر کا ہونا ضرور تھا اور یہ ایک دنیاوی امر تھا نہ مذہبی اور اس لئے

اسلام نے کوئی طریقہ اس کے لئے مقرر نہیں کیا۔ حق یہ ہے کہ منزل مسلمانوں کا خود ان کے افعال سے ہوا، مگر اس زمانہ میں ہم کو اس زوال کے اسباب سے بحث محض فصول پر کیونکہ وہ زمانہ عود نہیں کر سکتا بقول ہمارے معزز دوست مولوی حسرت احمد صاحب ایم۔ اے کے کہ ”گری قوموں کے سورج کو ڈوب کر پھر نکلتے نہیں دیکھا“ مصر، ایران، کارتیج، بابل، یونان اور مقدونیہ میں جو ملتیں ایک مرتبہ چھپائیں وہ آج تک نہ نکلیں گی وہ ہی زمین داسہاں رہے مگر نہ مصر کو کلوٹیرانہ یونان کو وہ اسطرونہ مقدونیہ کو وہ سکندر نہ دم کو وہ جولیس سیزر نہ ایران کو وہ کیکاوند نہ کارتیج کو وہ ہنری ہابل نہ بابل کو وہ بخت نصر میرائے ہم کو اپنے مطلع کا بھی یہی ڈر ہے۔ رفعت سلطنت کے جاتے رہنے کے بعد یہ امر قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے کہ ظلم اسلام پر پھر خالذ صرار، عقبہ، ابو عبیدہ، سعد، موسیٰ یا طارق جیسے ثوابت دیارے پھر چمکیں، مگر اتنا دیکھنا ہے کہ حالات موجودہ کے زلزلے جو سب طرح سے مایوسی فراہمیں سطح معمولی پر بھی قائم رہنے دیتے ہیں یا نہیں؟ پس ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس زمانہ میں اور موجودہ حالت میں جو ہندوستان کی اور قومیں ترقی کر سکتی ہیں اور مسلمان منزل کی حالت میں ہیں ان کے اسباب کیا ہیں اور انہی موانع کو دور کر کے ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ ہماری قوم اس منزل سے نکلے اور کم سے کم یہ مشکل دیگر قوموں کے ترقی کے میدان میں گونے سبقت لے جاوے۔

اس وقت ہماری قوم اگر مراکلیڈ کالون کی نصیحت پر عمل کرے تو بے شک اس کو کامیابی ہو سکتی ہے انھوں نے کہا ہے کہ ”مثل ہے کہ جب آدمی بدل جاتے ہیں تو ان کے اوضاع و اطوار کبھی ساتھ ہی بدل جاتے ہیں خاندان تیموریہ کی تلوار اگر اب بالائے طاق رکھی جاوے تو وہ مستعدی، استقلال و دلیری اور برداشت جو اس تلوار کے جوہر تھے اب بھی کام آسکتے ہیں جو کچھ آج کل مسلمانوں کو قائم رکھنا چاہیے وہ ان کے

آباد اجداد کا تند اور متعصبانہ جوش نہیں ہو بلکہ وہ بڑے اوصاف میں جنھوں نے اس تند اور متعصبانہ جوش کو فرمانروائی کے قابل بنایا تھا۔ وہ اوصاف کامیابی حاصل کرنے کے اب دوسرے مقاصد کے حاصل کرنے میں صرف کرنے چاہئیں۔“

ہمارے باپ دادا نے شخصیت حکومت برقی ہو یا جمہوری پھر انھوں نے جمہوری اصول کو توڑا ہو یا سرے سے اختیار ہی نہ کیا ہو وہ گزر گئے اور جو کچھ ان کو اچھا یا برا کرنا تھا وہ کر گئے ہم کو اپنا زمانہ بھگتنا ہے پس ہم کو وہ تدبیر کرنی چاہیے جو اس زمانہ کے حسب حال ہو اور اس کے سبب ہماری قوم موقر و خوش حال رہے ہو۔ اب اگلی حکومت کے خواب دیکھنے نہیں چاہئیں بلکہ اس بات کی فکر چاہیے کہ ہم کو ایک معزز اور ممتاز و فادار عالمائے مملکت کو کون و کونسیہ ایمپریس آف انڈیا ہو کر کس طرح اپنی ترقی کی کوشش کرنی چاہیے یہی ہمارا فرض اور دے مذہب کے ہے اور یہی راہ ہماری ترقی و خوش حالی کی ہے۔

باتمام محمد سعید صدیقی

(ادبی پریس لکھنؤ میں چھپی)

تعلیق

(متعلق صفحہ ۵۶)

(۱) الفاروق کے سلسلہ بیان میں حاشیہ صفحہ ۲۳۱ حیات شبلی پر مولانا شروانی کی جو تائید درج ہے اس میں تو لکھا ہے کہ ”یہ واقعہ خود سرپنٹے مجھ سے بیان کیا تھا“ مگر نواب عماد الملک کی لائف کے سلسلہ میں لانا شروانی نے اپنے قلمی خط مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء ”موسومہ سید ہاشم ندوی“ میں عبارت کے کیفیت و فرق سے لکھا ہے کہ ”الفاروق کے متعلق علامہ شبلی مرحوم نے واقعہ ذیل مجھ سے بالمشافہ بیان کیا تھا جو مجھ کو خوب یاد ہے اور تا امکان وہ ہی الفاظ لکھتا ہوں“

آخر میں سید کی تحریر کے متعلق یہ نوٹ بھی ہو کہ ”میں نے وہ تحریر اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی“ یا تو مولانا شروانی کی تحریر یا تائید میں نصرت کیا گیا خود مولانا شروانی کے حافظہ کی غلطی ہے۔

(۲) متعلق صفحہ ۱۱ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں جبکہ نواب عماد الملک زندہ تھے اور انہیں کی ہشتاد و سالہ جو بلی میں یہ نمبر شائع ہوا تھا، مولوی عبدالحکیم شرر نے خود مولانا کے خاص دوستوں میں ہیں لکھتے ہیں کہ

”مولوی شبلی نعمانی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تو ہسکا ایک نسخہ نواب عماد الملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور خواہش کی کہ اسکی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں، اس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:-

”گزشتہ تین سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر بن الخطاب لہذا ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت میں جبراً کو آپ نے ادا کیا“

اس دور فی تبصرہ سے صاف ظاہر ہے کہ محض سسید پر حملہ کے لئے ان کو اختلاف کو یہاں زور شون ظاہر کیا گیا۔ اور حملہ میں ورپید کرنے کے لئے عماد الملک کا نام دیربان میں لایا گیا۔

صفحہ ۹۱۔ زمانہ سسید کے جن طلباء کا نام درج ہے۔ ان میں ایک سب سے بڑا نام ڈاکٹر حامد علی (نواب خاندان جنگ) کا ہے جنہوں نے متفرق طور پر پیش قرا ہلو کے علاوہ چار پانچ سال ہوئے کہ اپنا تمام سرمایہ عمری تقریباً تیرہ لاکھ روپیہ کا سرمایہ مسلمانوں کے تعلیمی وظائف کے لئے حکومت نظام کو تفویض کر دیا۔

نندوہ کو قائم ہوئے بھی پچاس سال گزر چکے اس کے طلباء اور حامیوں میں بڑے بڑے المدار رؤسا اور ذی ثروت ہیں کیا کوئی مثال متذکرہ اصحاب میں سے کسی مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہو؟ خود مصنف سو انج نے آخری عمر میں جب کہ نندوہ کو بھی ان کی سخت ضرورت تھی اور دارالمصنفین کے لئے زندگی وقف کر چکے تھے بھوپال کے عہد قضا و غیرہ کے گرانقدر شاہرہ کو ترجیح دے کر ملازمت اختیار کر لی۔

بر خلاف ان کے اسی کالج کے ایک نامور اور قابل ترین اولڈ بوائے ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خاں ایم اے۔ پی ایچ، ڈی، شیخ جامعیہ (دھلی) نے قوم کی تعلیمی خدمات اور جامعہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے اسی زمانہ میں جب کہ علامہ موصوف سند قضا و پر جلوہ افروز ہوئے حکومت ہند کی ممبری کی پیشکش کو مسترد کر دیا جس کا اقتدار و مشاہرہ علامہ کے عہدہ سے بدرجہا زیادہ تھا۔ بہ بین تفاوت یہ از کجا ست تا بہ کجا۔

5120

CF

DUE DATE
